اپنی محفل اپنے دوست

جگن ناتھ آزاد

کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز جموں (جے اینڈ کے) انڈیا

جگن ناتھ آزاد

کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، جموں (جے اینڈ کے) انڈیا

ستاروں سے ذرّوں تک

(جگن ناتھ آزاد کا دوسرا مجموعۂ کلام)

جگن ناتھ آزاد دورِ حاضر کے دل پسند اور ممتاز شاعر ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے اُنھیں اپنے فرائض کا احساس ہے اس وجہ سے وہ ستاروں کو نظر انداز کرتے ہیں، نہ ذرّوں کو۔ آزاؔد کے شعروں کی نرم آواز اور دھیمی کسک جو بظاہر ایک قسم کے شخصی اظہار اور ذاتی اُفتادِ طبع کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، آہستہ آہستہ سننے اور پڑھنے والے کے احساس کا جزو بن جاتی ہے، متاثر کرنے کی یہ صلاحیت حقیقی جذبات کے پیش کرنے اور فن کے شعوری طور پر برتنے سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں باتیں آزاؔد کے کلام میں دیکھی جا سکتی ہیں جن کا ارتقا چند برسوں کے اندر ہوا ہے۔ لاہور نے اُنھیں شعر کہنے اور شعری فضا میں رہنے بسنے پر مائل کیا تھا۔ لاہور کے فراق نے اُن کے کلام میں گداز، انسانیت اور غنائیت کے عناصر پیدا کیے ہیں۔ اُنھی عناصر کے فن کارانہ اظہار میں اُن کی ہر دل عزیزی اور ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔

احتشام حسین

چھٹا اڈیشن ——— قیمت: ۸۰ روپے

ملنے کا پتا: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۲

اپنی محفل اپنے دوست

کتاب کا نام :	اپنی محفل اپنے دوست
مصنف :	جگن ناتھ آزاد
سنہ اشاعت :	۲۰۰۳ء
سرورق :	شاہ درویش
قیمت :	۲۵۰/روپے
	۲۵/امریکی ڈالر - ۱۵/برطانوی پونڈ
کمپوزنگ :	کریسنٹ ہاؤس آف اِنفارمیشن ٹکنالوجی، جموں
بہ اہتمام :	اُختر زماں/ ''سب رنگ'' (این جی او)
طباعت :	ثمر آفسیٹ پرنٹرز - نئی دہلی
ناشر :	کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، جموں (جے اینڈ کے)

"APNI MEHFIL APNE DOST"

AUTHOR : JAGAN NATH AZAD

2003

PRICE : Rs.250/-

PUBLISHER

CRESCENT HOUSE PUBLICATIONS JAMMU

267-JOGI GATE, JAMMU -180001.

J&K (INDIA) PH : 0191-2543645.

تقسیم کار

☆ انجمن ترقی اُردو (ہند) اُردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی- ۱۱۰۰۰۲

☆ کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، ۲۶۷-جوگی گیٹ، جموں (جے اینڈ کے) ۱۸۰۰۰۱

اِنتساب

شاعر، نقّاد اور محقق

اپنے عزیز دوست

مظہر امام

کے نام

جگن ناتھ آزاد

فہرست

حرفِ اوّل

جہاں تک خاکہ نگاری، شخصیت نگاری یا میری یاداشتوں کے اوراق کا تعلق ہے، زیرِ نظر کتاب ''اپنی محفل اپنے دوست'' میرا دُوسرا مجموعہ مقالات ہے۔ پہلا مجموعہ ''آنکھیں ترستیاں ہیں'' کے نام سے ہندوستان میں دوبار اور پاکستان میں تین بار شائع ہو چکا ہے۔ دونوں مجموعوں میں فرق یہ ہے کہ ''آنکھیں ترستیاں ہیں'' اُن مقالات پر مشتمل ہے جو راقم التحریر نے اپنے دوستوں اور بزرگوں کے انتقال کے بعد اُن کی یاد میں لکھے (ہاں اُس کتاب کا ایک مضمون ''کرشن چندر'' کرشن چندر کی زندگی ہی میں لکھا گیا تھا۔ اب یاد نہیں آ رہا ہے کہ اُس مضمون کو یادِ رفتگاں میں شامل کرنے کا سبب کیا تھا)۔

زیرِ نظر کتاب ''اپنی محفل اپنے دوست'' میں جس قدر مقالات شامل ہیں وہ اپنے دوستوں کی زندگی ہی میں لکھے گئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت جب اِس کتاب کا مسودہ طباعت کے لئے مطبع کو جا رہا ہے ان میں بعض اصحاب ہمیں داغِ فُرقت دے چکے ہیں مثلاً جوش ملیح آبادی، مالک رام، علی سردار جعفری، سلیم جعفری، آپا حمیدہ سُلطان احمد، گوپال مِتّل، حکیم عبدالحمید، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور دینا ناتھ مست۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے دوستوں کو جو ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گئے ہیں فراموش نہیں کر سکتا۔ علامہ اقبال نے کیا عمدہ کہا ہے ۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو
یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو

دامنِ دل بن گیا ہو رزم گاہِ خیر و شر
راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر

خضرِ ہمت ہو گیا ہو آرزوئے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر

وادیٔ ہستی میں کوئی ہمسفر تک بھی نہ ہو
جادہ دِکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہوں اندھیری رات میں

جوش ملیح آبادی پر میں نے بہت مقالات لکھے ہیں لیکن وہ مقالات تنقیدی نوعیت کے ہیں۔ ایک مقالہ ''اقبال اور جوش'' میری تصنیف ''ہندوستان میں اقبالیات'' میں شامل ہے۔ اُن کے بارے میں چند نظمیں بھی میں نے کہی ہیں جو میرے مجموعۂ کلام ''جستجو'' میں شریکِ اشاعت ہیں۔ ظاہر ہے زیرِ نظر کتاب میں مشمولہ مقالہ اُن کے ساتھ ابتدائی مُلاقاتوں پر مشتمل ہے۔ جوش کی شاعری کی طرح اُن کی نثر بھی زندۂ جاوید حیثیت رکھتی ہے۔ ایسے عالم اور صاحب طرز شاعر اور نثر نگار کے ساتھ چند روز بسر کرنا بھی بڑی سعادت ہے اور میں نے تو اُن کے ساتھ نو برس بسر کیے۔ اُن کا خیال آتا ہے تو اقبال کا یہ شعر مجھے یاد آجاتا ہے۔

اے کہ نزدیک تر از جانی و پنہاں زنگہ
ہجر تو خوشترم آمد ز وصالِ دگراں

مالک رام اور علی سردار جعفری سے متعلق بھی میں نے خاصی تعداد میں مقالات لکھے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں جو دو مقالے شامل ہیں ان میں اُن کی شخصیت کی محض ایک جھلک نظر آتی ہے۔ اُن پر تنقیدی مقالات کے علاوہ اُن کی شخصیت پر میں نے اور بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ انشا اللہ تمام مقالات میری مختلف کتابوں میں شائع ہوں گے۔

گوپال متل کے ساتھ دوستی لاہور کے زمانے سے چلی آرہی تھی۔ دینا ناتھ مست بھی باکمال شاعر اور اُردو کے خادم تھے۔ کشمیر ہی میں اُن کے ساتھ دوستانہ مراسم کی ابتدا ہوئی۔ سلیم جعفری کے ساتھ علمی رشتے کے علاوہ میرا ایک رشتہ یہ بھی تھا کہ وہ میرے عزیز دوست بلکہ بھائی ذکر الرحمٰن کے داماد تھے۔ ذکر الرحمٰن اور اُن کے خاندان کے ساتھ راولپنڈی کے زمانے میں ہمارے خانوادے کی انتہائی قُربت تھی۔ میرے والدین کے راولپنڈی سے دہلی چلے آنے اور ذکر الرحمٰن اور فضل الرحمٰن اشک کے خانوادے کے کراچی چلے آنے کے بعد بھی دونوں گھرانوں میں یہ رشتہ مودّت قائم رہا۔

حکیم عبدالحمید کے بارے میں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ تو انسانیت کی خدمت ہی کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ ہم ہندوؤں میں ایسے انسانوں کو راج رشی کہا جاتا ہے۔ اُنھوں نے ایک کروڑ سے زیادہ مریضوں کا علاج اپنی زندگی میں کیا۔ دوا خانے قائم کیے، یونیورسٹی بنائی۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں لوگوں کو روزگار مہیا کیا لیکن اپنی زندگی فقیرانہ طور پر بسر کی۔ جو روپیہ کمایا اُس سے ملک و قوم کو پورا فائدہ پہنچایا، علمی اعتبار سے بھی، تعلیمی اعتبار سے بھی اور طبّی اعتبار سے بھی۔

ع - خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

کنور مہندر سنگھ بیدی کی ذات ایک کھرے ہیرے کی طرح تھی۔ ہر شخص کی بروقت مدد کرنے کو تیار۔ اُردو کے عاشق اور اُردو کے خادم۔ ہندوستان اور پاکستان کی محبوب ترین شخصیتوں

میں سے ایک۔ مشہور شاعر تو تھے ہی نثر بھی دِلکش لکھتے تھے۔

اِس مختصر سی تحریر میں جن حضرات کا میں نے ذکر نہیں کیا وہ خداوند کریم کے فضل و کرم سے ہمارے درمیان موجود ہیں اور اپنے اپنے علمی اور ادبی کام میں مصروف ہیں۔ خدائے پاک انھیں طویل زندگی عطا کرے۔ آمین!

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ زیرِ نظر کتاب ''اپنی محفل اپنے دوست'' میرے عزیز دوست امین بنجارہ نے مرتب کی ہے۔ میں ان کا ممنون ہوں۔ میرے ادبی مضامین کا مجموعہ ''تعمیرِ فکر'' بھی انھی نے مرتب کیا ہے۔ ''سلام و پیام'' بھی۔ میں ان کی علمی اور ادبی ترقی کے لیے بھی دُعا گو ہوں اور ان کی طویل زندگی کے لیے بھی۔

ع - ایں دُعا از من و از جُملہ جہاں آمین باد!

جگن ناتھ آزاد

جموں یونی ورسٹی

جموں

۱۴ر جون ۲۰۰۳ء

جوش صاحب کے ساتھ

اِبتدائی مُلاقاتیں

(یادوں کے جھروکوں سے)

یوں تو حضرت جوش ملیح آبادی کے ساتھ میری ملاقاتیں تقسیم ہند سے پہلے ہی شروع ہو گئی تھیں لیکن وہ جسے رفاقت کہتے ہیں آزادی کے بعد شروع ہوئی، ۱۹۴۸ء میں' جب کہ جوش صاحب پبلی کیشنز ڈویژن دہلی میں شعبہء اُردو کے مدیر مقرر ہوئے اور میں اُن کا نائب مدیر۔

تقسیم ہند سے پہلے کی ملاقاتوں کی رُوداد بہت مختصر ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اُنھیں ملاقاتیں کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔

غالباً ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء کی بات ہے رابندر ناتھ ٹیگور لاہور تشریف لائے تھے، اُن کے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا' بریڈلاء ہال میں۔ اس مشاعرے میں جوش صاحب کو میں نے پہلی بار دیکھا، بہت ادب کے ساتھ انھیں سلام کیا۔ ان کا کلام ان کی زبانی سننے کا بڑا اشتیاق تھا۔

وہ شوق پورا نہ ہو سکا کیونکہ اُس مشاعرے میں دو ایک اشعار سننے کے بعد سامعین نے انھیں ہوٹ کر دیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جوش صاحب نے اپنی نظم ''پروگرام'' ترنم سے پڑھنا شروع کی۔ ترنم ان کا خاصا بھونڈا تھا۔ ابھی ایک یا دو شعر ہی پڑھے ہوں گے کہ سامعین کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور جوش صاحب کو واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ جانا پڑا۔

چند برس کے بعد جوش صاحب پھر لاہور تشریف لائے۔ اَب کے مجاز بھی ان کے ساتھ تھے۔ رائل ہوٹل (انارکلی) میں اُن کا قیام تھا۔ میں اُس زمانے میں لاہور میں مقیم تھا اُن سے ملنے کے لئے گیا۔ شام کا وقت تھا۔ سامانِ نائے ونوش ان کے سامنے موجود۔ اگرچہ ابھی نائے ونوش کا شغل شروع نہیں ہوا تھا۔ شاید غروبِ آفتاب میں ابھی کچھ دیر تھی اور جوش صاحب اس کے انتظار میں تھے۔ چودھری نذیر احمد مالک مکتبۂ اُردو لاہور وہاں پہلے سے موجود تھے۔ غالباً یہ دعوت انھی کی طرف سے تھی اگرچہ وہ نائے ونوش میں شریک نہیں ہوئے۔

جوش صاحب کی یہ آمد بھی ایک مشاعرے کے سلسلے میں تھی اور یہ مشاعرہ انڈین نیشنل کانگریس نے منعقد کیا تھا۔ میں ڈاکٹر ٹیگور والے مشاعرے میں مدعو نہیں تھا۔ میں اُس میں والد محترم کے ہمراہ گیا تھا۔ لیکن جوش صاحب کو نہ سُن سکا۔ کانگریس والے مشاعرے میں میں مدعو تھا لیکن میں گیا نہیں کیونکہ میں اس زمانے میں بی اے پاس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت کی تلاش میں تھا۔ اور اس صورت میں کانگریس کے مشاعرے میں شرکت خلافِ مصلحت تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ سرکاری ملازمت مل نہ سکی۔

دُوسرے روز احباب اور اخبارات کے ذریعے سے مشاعرے کی رُوداد معلوم ہوئی۔ پتہ چلا کہ جوش صاحب نے مشاعرہ لُوٹ لیا۔

تیسری ملاقات امرتسر کے ایک مشاعرے میں ہوئی۔ یہ مشاعرہ جنگی مشاعرہ تھا یعنی دُوسری جنگِ عظیم کے دِنوں میں انگریزوں کی مدد کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ ریاض قریشی ریلوے

مجسٹریٹ امرتسر اس مشاعرے کے منتظم تھے اور ای۔ پی مون ڈپٹی کمشنر امرتسر اس کے سرپرست۔ یہ مشاعرہ امرتسر کے ایک سینما ہال میں منعقد ہوا تھا۔

یہ مشاعرہ تھا تو جنگ کے مقاصد کی حمایت میں لیکن جوش نے اپنے کلام کی ابتدا اس قطعے سے کی۔

سنو اے ساکنانِ خاکِ پستی
ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

اس قطعے پر سامعین کی کیا حالت ہوئی یہ بیان کرنا مشکل ہے۔ مشاعرہ گاہ میں گویا قیامت آ گئی۔ لوگ اُچھل اُچھل کر داد دے رہے تھے۔ منتظم مشاعرہ ریاض قریشی کی حالت قابل دید تھی۔ اُن کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ وہ بچارے کبھی ای۔ پی۔ مون کی طرف دیکھتے تھے کبھی جوش کی طرف۔ ڈائس پر بیٹھے ہوئے شعراء میں کھسر پسر ہونے لگی کہ کل ریاض قریشی ملازمت سے برطرف کر دیئے جائیں گے۔ جوش ملیح آبادی کل گرفتار کر لیے جائیں گے۔ اور جوش ان تمام باتوں سے بے نیاز اپنی نظم سنانے میں گُم تھے۔ قطعے کے بعد اُنھوں نے یہ نظم شروع کی تھی:

آج اگر راون کا گھر سیتا کا زنداں ہے تو کیا!

نظم پوری طرح سامعین کے جذبات کا ساتھ دے رہی تھی۔ اور پھر جوش کے پڑھنے کا انداز! قیامت پر قیامت برپا ہو رہی تھی۔

جوش صاحب کی زبانی اُن کا کلام سننے کا یہ میرا پہلا موقع تھا (بریڈ لاء ہال والے مشاعرے کو چھوڑ کے جہاں سننا نہ سننا برابر ہو گیا تھا) اور ظاہر ہے کہ اس تاریخی کلام خوانی سے میں کتنا متاثر ہوا ہوں گا۔

☆☆☆☆☆

وقت گزرتا چلا گیا۔ ملک تقسیم ہو گیا اور میں ایک ریفیوجی کی حیثیت سے دہلی آ گیا۔ اپنی داستانِ ہجرت میں اپنی خود نوشت سوانح حیات ''باتیں ہماری یاد رہیں'' میں تفصیل سے سُنا چکا ہوں اس لیے اِس رُوداد کو یہاں نہیں دہراؤں گا۔ صرف اتنا ہی بیان کروں گا کہ سردار پٹیل نے وزارت اطلاعات ونشریات کے سربراہ کا عہدہ سنبھالتے ہی ''آج کل'' مرحوم کو دوبارہ زندہ کیا اور اس کے ساتھ ہی دو اور ماہنامے بھی معرض وجود میں آئے۔ ''بساطِ عالم'' اور ''نونہال''۔ ''بساطِ عالم'' بین الاقوامی ذکر اذکار کے لیے وقف تھا اور ''نونہال'' بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے۔ دراصل یہ تینوں ماہنامے شعبہء اُردو کے کام کا ایک حصہ تھے اور شعبہء اُردو کا کام خاصا وسیع تھا۔ اُردو پمفلٹوں کی اشاعت ایک بہت بڑا کام تھا جو اِس شعبے کے سپرد تھا۔

جب اس شعبے کے ادارتی اسٹاف کا انتخاب ہوا تو جوش صاحب اس کے مدیرِ اعلیٰ اور عرش ملسیانی، راقم التحریر اور بلونت سنگھ اِس کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔ بعد میں پنڈت ہری چند اختر بھی نائب مدیروں کی صف میں آ کے شامل ہو گئے۔

ایک پنڈت ہری چند اختر کو چھوڑ کر باقی تمام نے مئی ۱۹۴۸ء میں اپنے اپنے عہدے سنبھال لیے اور کام کی تقسیم یوں ہوئی کہ ''آج کل'' عرش کے حصے میں آیا، ''بساطِ عالم'' کی ادارت راقم التحریر کے سپرد ہوئی اور ''نونہال'' بلونت سنگھ کے حوالے ہوا۔ جوش صاحب کی حیثیت مدیرِ اعلیٰ کی تھی۔ (اوّل اوّل تینوں جرائد پر تینوں مدیروں کے نام آتے تھے بعد میں ہر جریدے پر جوش صاحب کے ساتھ صرف اُن کا نام آنے لگا جو ان جرائد کو مرتب کرتے تھے)

پہلے ہی دن جوش صاحب سے جب تفصیلی ملاقات ہوئی تو محسوس ہوا کہ ایک باغ و بہار شخصیت کی صحبت نصیب ہوئی ہے۔ جوش صاحب تہذیب و شرافت کا بھی مرقع تھے اور لکھنوی آداب، رکھ رکھاؤ اور تکلفات کا بھی۔ پہلی بار جب میں ان کے کمرے میں گیا اور ''آداب عرض'' کہا تو وہ کھڑے ہوئے، ہاتھ ملایا اور آداب عرض کا جواب دیا۔ اگرچہ ان کے اس طرح کھڑے ہونے سے مجھے embarrasement ہوئی لیکن میں نے سمجھا کہ چونکہ میں پہلی بار ان کے کمرے

میں حاضر ہوا ہوں اُنھوں نے تکلف سے کام لیا ہے۔ مُجھے کیا معلوم تھا کہ ہر روز جب بھی میں ان کے کمرے میں داخل ہوں گا وہ اسی طرح احتراماً کھڑے ہوں گے، ہاتھ ملائیں گے، ''آداب عرض'' کہیں گے اور تب اپنی کرسی پر بیٹھیں گے۔

تیسرے ہی دن میں نے اُن کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ ہر روز اس طرح زحمت نہ کیا کریں۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا میرے لیے سعادت کا باعث ہے۔ آپ ہر روز کھڑے ہو کر ملتے ہیں اس سے مُجھے بڑی اُلجھن ہوتی ہے۔ لیکن ان کا یہ معمول اس وقت تک جاری رہا جب تک وہ ہندوستان میں رہے۔

اسی روز بات چیت کے دوران میں ان سے میں نے یہ بھی کہا کہ آپ اگر میری زبان اور میرے لب ولہجہ پر نظر رکھیں اور گفتگو کے دوران میں میری اغلاط سے مجھے آشنا کریں تو میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ کہنے لگے آزاد صاحب یہ کہنا آسان ہے لیکن اس پر عمل کرنا مشکل ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کسی وقت بُرا مان جائیں اور اس کا اثر ہمارے باہمی تعلقات پر پڑے۔ میں نے کہا جوش صاحب نہ میں بُرا مانوں گا اور نہ ہی کبھی میرے آپ کے تعلقات میں خرابی آئے گی۔ لیکن ایک بات ہے اور وہ یہ کہ میں کسی وقت آپ کی اصلاح قبول نہ کر سکوں تو آپ بھی برا نہیں مانیں گے۔

اس پر وہ ذرا چونکے اور کہا ''کیا مطلب؟''

میں نے بڑے ادب سے عرض کیا کہ میں زبان کے معاملے میں مولانا تاجور نجیب آبادی کا شاگرد ہوں۔ وہ دہلی کی زبان کو سند مانتے ہیں اور آپ کے لیے لکھنؤ کی زبان سند ہے۔ اپنی اغلاط کی تصحیح کے لئے میں ہر وقت تیار ہوں لیکن دہلی اور لکھنؤ کی زبان اور محاورے کے متعلق مُجھے آزادی ہونا چاہئے کہ میں جسے چاہوں قبول کروں۔

اُن کے چہرے سے مُجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے میری اس بات کو اُنھوں نے پسند نہیں کیا لیکن اُنھوں نے جواب میں ایسی کوئی بات نہ کہی جس سے یہ ظاہر ہو کہ میری بات اُنھیں ناگوار گزری ہے۔

☆☆☆☆☆

کچھ دن بعد کی بات ہے میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا اور حسبِ دستور اُن سے کہا ''آداب عرض جناب، مزاج اچھے ہیں۔'' وہ بھی حسبِ معمول اپنی جگہ سے اُٹھے، ہاتھ ملایا لیکن فوراً ہی یہ جملہ کہا:

''دیکھیے جناب، مزاج اگرچہ مختلف کیفیتوں کا مجموعہ ہے لیکن ہے واحد، جمع نہیں ہے۔''

میں نے کہا اس اصلاح کا شکریہ لیکن غالباً احترام کے خیال سے ہم لوگ ''مزاج اچھے ہیں؟'' کہتے ہیں۔ کہنے لگے ''احترام اپنی جگہ پر بجا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ واحد کو جمع بنا دیں۔'' زبان کے معاملے میں یہ پہلا درس تھا جو مجھے جوش صاحب سے ملا۔

چند دن بعد پروفیسر آلِ احمد سرور اُن سے ملنے کے لیے آئے۔ اُنھوں نے آتے ہی کہا۔ آداب عرض ہے جوش صاحب، مزاج اچھے ہیں۔ جب وہ ایک آدھ گھنٹہ بیٹھ کے اور بات چیت کر کے چلے گئے تو میں نے کہا، آپ نے دیکھا ان صاحب نے بھی یہی کہا تھا ''مزاج اچھے ہیں؟'' جھٹ سے بولے یہ لوگ یونی ورسٹیوں کے پروفیسر ہیں۔ انھیں زبان وادب سے کیا تعلق؟

☆☆☆☆☆

اسی طرح وقت گزرتا گیا۔ ہمارا دستور یہ تھا کہ دن میں ہم تینوں' عرش، بلونت سنگھ اور راقم التحریر اپنا اپنا کام نپٹا کر جوش صاحب کے کمرے میں جمع ہو جاتے تھے۔ اکثر تو ایسا ہوتا تھا کہ وہاں کوئی نہ کوئی صاحب پہلے سے موجود ہوتے تھے اور محفل جمی ہوتی تھی۔ یا ہمارے جانے کے بعد ایک یا دو یا تین چار اہلِ قلم آجاتے تھے اور محفل اپنے رنگ پر آجاتی تھی۔ اگر باہر سے کوئی نہ ہوتا تو ہم تین ہی محفل جمانے کے لیے کیا کم تھے۔ اور جوش صاحب تو خود ایک محفل سے کم نہیں تھے۔ وہ انجمن بھی تھے اور جانِ انجمن بھی۔ بلونت سنگھ نے اس محفل میں بیٹھنا جلد ہی ترک کر دیا تھا کیونکہ انھیں شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ جوش صاحب گھر سے کوئی نظم مکمل کر کے لاتے تھے اور فوراً ہی

چپراسی کے ہاتھ ہمیں پیغام بھیجتے تھے کہ آپ سب حضرات آجائیے۔ چنانچہ ہم پہنچ جاتے تھے۔ جوش صاحب اپنا کلام سناتے تھے اور داد کے طوفان میں یہ محفل ختم ہوتی تھی۔

ایک دن کی بات ہے ایسی ہی ایک محفل جمی ہوئی تھی اور جوش اپنی نظم سُنا رہے تھے۔ غالباً عنوان یہ تھا ''سینۂ عدم میں وجود کا پیچ و تاب''۔ طویل نظم تھی، چالیس پچاس اشعار پر مشتمل۔ تو عرش نے کہا کہ نظم لاجواب ہے اور اس میں خوبی یہ ہے کہ ایک ہی بات کو پچاس بار مختلف انداز سے کہا گیا ہے۔ معلوم نہیں عرش نے یہ بات تعریفی انداز میں کہی تھی یا تنقیصی انداز میں، لیکن جوش یہ سُن کے بولے ''ہاں یہ تو ہمارا خاص فن ہے اور اس خشک فلسفیانہ موضوع کو دلکش بنانے کے لیے اسے طرح طرح سے بیان کرنا بھی بہت ضروری ہے۔'' اور پھر میر انیس کا یہ مصرع پڑھا:

ع - اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں''

میرے منہ سے اِتنا ہی نکلا ''لیکن انیس نے یہ مصرع فلسفیانہ شاعری کے متعلق نہیں کہا۔'' کیسی شاعری کے متعلق کہا ہے؟'' جوش صاحب نے سوال کیا۔ میں نے عرض کیا ''فلسفیانہ شاعری میں کمالِ فن ایجاز ہے نہ کہ اطناب جیسے ملٹن کی شاعری میں۔'' عرش اور بسمل بھانپ گئے کہ میں نے مصلحتاً اقبال کا نام نہیں لیا۔ یہ دونوں ایسی محفلوں کے مردِ میدان تھے۔ اُنھوں نے کوئی اور موضوع چھیڑ کے بات کا رُخ بدل دیا کیونکہ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ بات چیت جوش صاحب کو پسند نہیں آرہی ہے۔

اقبال کا تعریفی انداز میں ذکر جوش صاحب کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ خدا جانے اقبال کے تعلق سے کون سا احساسِ کمتری اُن کے اندر کام کر رہا تھا کہ اقبال کی بات ہوتی تھی تو ان کی کیفیتِ انقباض ان کے چہرے سے ظاہر ہو جاتی تھی۔ اگرچہ اقبال کے بعد اہلِ ملک نے عزت اور محبت کے خزانے جوش صاحب ہی پر نچھاور کیے تھے لیکن وہ غالباً اس قدر دانی سے مطمئن نہیں تھے۔ اُن کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ وہ اقبال سے زیادہ بڑے شاعر ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اقبال کو بڑا شاعر تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ ہاں کبھی موڈ میں ہوتے تھے تو اُن کے کسی شعر کی تعریف

کر بھی دیتے تھے۔ مثلاً یہ شعر اُنھوں نے کئی بار ہمیں سُنایا اور اس کی تعریف کی

بُوعلی اندر غُبارِ ناقہ گُم
دستِ رُومی پردۂ محمل گرفت

ویسے اقبال کے اکثر اشعار پر وہ اعتراض ہی کیا کرتے تھے اور اعتراض بھی طعن و تشنیع کے انداز میں۔ یہی اعتراضات اب اُن کی خود نوشت سوانح حیات ''یادوں کی برات'' میں شامل ہیں لیکن کسی اور کے نام سے۔ مثلاً یہ کہ فلاں صاحب اقبال کے اشعار پر اعتراض کرتے ہوئے یہ کہا کرتے تھے کہ جرائم کئی رنگ کے ہوتے ہیں، سرخ، سپید، سبز، سیاہ، اقبال کے جرائم سیاہ تھے اور اُن سیاہ جرائم کو ایک شامیانے کے نیچے امان ملی تھی جس کا نام تھا عفوِ بندہ نواز۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے اعتراضات سے محفل بے لُطف ہو جاتی تھی۔ میں اس طرح کے اعتراضات سُن کر خاموش ہی رہتا تھا۔ خاموشی کا بڑا سبب یہ تھا کہ بحث کرنے سے بات کے بگڑ جانے کا اندیشہ رہتا تھا اور ممکن تھا کہ بات بگڑ جانے سے یہ محفل ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی اور اگر محفل برقرار رہتی اور میں اس میں شریک نہ ہوتا تو اور بُری بات ہوتی۔ دُوسرا جوش صاحب کو خفا کرنے کا تو میں تصوّر ہی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ احتیاط برتنے کے باوجود صورتِ حال خراب ہو گئی۔ اس طرح کا ایک واقعہ میں یہاں درج کرتا ہوں۔

جگر صاحب نے ایک غزل کہی تھی

تُو مرے حالِ پریشاں پہ بہت طنز نہ کر
اپنے گیسو بھی ذرا دیکھ کہاں تک پہنچے

میں نے بھی اسی زمین میں ایک غزل کہی۔ اُسی زمانے میں ''الحمراء'' لاہور میں ڈاکٹر محمد باقر کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں صاحبِ مضمون نے کلامِ اقبال میں ''تضادات'' کو نمایاں کیا تھا۔ میں نے یہ مقالہ پڑھا تو اپنی غزل کے آخر میں اس قطعے کا اضافہ کیا

بحرِ اقبال کی تہ تک نہ پہنچنے والے
حیف گر عزم ترا سطحِ رواں تک پہنچے
عقل اور عشق تضادات نہیں ہیں ہرگز
سخت حیرت ہے جو ادراک یہاں تک پہنچے
جلوۂ عشق بجز روشنی عقل نہیں
کاش یہ نکتہ تری ظلمتِ جاں تک پہنچے

انھی دنوں میں ڈاکٹر یوسف حسین خان کی کتاب ''رُوحِ اقبال'' جوش صاحب کے زیرِ مطالعہ تھی اور وہ اس کے حاشیے پر جابجا طنزیہ جملے لکھ رہے تھے۔ یہ داستان میں اسی تحریر میں آگے چل کے سناؤں گا پہلے اپنی غزل اور قطعے والی بات ختم کر لوں۔

تو چونکہ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی کتاب جوش صاحب کے زیرِ مطالعہ تھی اس لیے وہ کبھی کبھار دفتر میں ہم لوگوں کے ساتھ بات چیت میں بھی اس کتاب کا ذکر لے بیٹھتے تھے اور اقبال کے اکثر تصوّرات زیرِ بحث آجاتے تھے۔ جوش صاحب چونکہ عشق پر عقل کی فوقیت کے مدّعی تھے اس لیے عقل اور عشق کا موضوع بالعموم زیرِ بحث آجاتا تھا۔ اب جو عقل و عشق کے موضوع پر میرے یہ اشعار ''الحمراء'' میں چھپے تو میرے ایک دوست بسمل سعیدی نے جا کر ''الحمراء'' کا یہ شمارہ کھول کے اُن کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ آپ تو آزاد کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں اور اُس نے تو آپ کے متعلق یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

کاش یہ نکتہ تری ظلمتِ جاں تک پہنچے

جوش صاحب کانوں کے کچے تو تھے ہی۔ فوراً اس بات پر اُنھوں نے یقین کر لیا کہ یہ قطعہ میں نے ان کے بارے میں کہا ہے۔ اُدھر تو میرے مذکورہ دوست نے میرے خلاف جوش صاحب کے کان بھرے اور اِدھر مجھ سے آ کے کہہ دیا کہ آج میں جوش صاحب کے کمرے میں گیا تو ''الحمراء'' کا وہ شمارہ جس میں آپ کے اشعار چھپے ہیں اُن کے سامنے رکھا تھا اور وہ آپ کے اشعار پڑھ

رہے تھے۔ میں گھبرا گیا کہ رقیب رُوسیاہ اپنا کام کر گیا۔ دو تین دن میں اس تذبذب کے عالم میں رہا کہ جوش صاحب کو کیسے یقین دلاؤں کہ یہ اشعار میں نے آپ کے متعلق نہیں کہے۔ چنانچہ دو تین روز تک ان سے ملنے کی جرأت میں نے نہیں کی۔ اب میرے مذکورہ دوست کو اپنی بات کے یقین دلانے کا اور زیادہ موقع مل گیا۔ اُنھوں نے جوش صاحب سے کہا کہ دیکھیے یہ اشعار چھپنے کے بعد آزاد آپ سے نہیں ملا۔ جوش صاحب کو پہلے ہی یقین آ چکا تھا کہ یہ اشعار میں نے اُن کے خلاف کہے ہیں، اب یہ یقین اور پختہ ہو گیا۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک پرچہ لکھ کر چپراسی کے ہاتھ میرے پاس بھیجا۔ اس میں اُنھوں نے لکھا تھا:

''میاں آزاد، میں کوئی لونڈا نہیں ہوں کہ ذرا سی
بات کا بُرا مان جاؤں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ میرے پاس
آئیں۔ ہم دونوں اِقبال کے نظریہء عقل و عشق پر بحث کریں
اور ایک نتیجے پر پہنچیں۔''

مُجھے جب یہ پرچہ ملا تو میں اپنے کام میں بے حد مصروف تھا۔ میں نے جواب میں لکھ بھیجا:

''محترم المقام!
عنایت نامے کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ اس وقت بے حد
مصروف ہوں۔ کوئی ایک گھنٹے میں حاضر ہوں گا۔ ویسے میں یہ
سمجھتا ہوں کہ اَدبی بحث کا مقصد کسی نتیجے پر پہنچنا نہیں ہوتا بلکہ
مختلف مسائل اور پہلوؤں کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔''

چنانچہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد میں اُن کے کمرے میں حاضر ہوا۔ جوش صاحب حسبِ معمول اُٹھ کے مُجھ سے ملے۔ میرے مذکورہ دوست بھی وہاں موجود تھے اور منافقت کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ سب سے پہلے تو میں نے جوش صاحب کے سامنے اپنی صفائی پیش کی اور کہا یہ صحیح ہے کہ اقبال کے فکر و فن سے متعلق میرے اور آپ کے خیالات میں بہت فرق ہے لیکن میں کبھی اس بات

کا تصوّر ہی نہیں کر سکتا کہ آپ کی طرف میرا روئے سخن اس طرح کا ہو گا۔ یہ اشعار میں نے ''الحمراء'' کے ایک مقالے کے جواب میں کہے ہیں۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ وہ مقالہ دو ماہ قبل چھپا تھا۔ جب میں نے اپنے اشعار راجہ حامد علی خان کو بھیجے تو اگلے ماہ کا شمارہ پریس میں جا چکا تھا اور اب جب میرے اشعار والا شمارہ چھپ کے آیا تو یہاں چند روز سے اقبال کے نظریہء عقل و عشق پر بحث چل رہی تھی۔ میں نے اُن سے یہ بھی کہا کہ میں نے اپنی غزل کے بعد قطعے کے شروع میں یہ لکھا تھا:

ڈاکٹر محمد باقر سے معذرت کے ساتھ

لیکن راجہ حامد علی خان نے اسے بدل کے لکھ دیا:

نقادانِ اقبال سے معذرت کے ساتھ

اب معلوم نہیں جوش صاحب کو میری اِن تمام باتوں کا یقین آیا یا نہیں، لیکن یہ سب کچھ کہہ دینے کے بعد میرے دل پر سے بوجھ ہٹ گیا۔

جوش صاحب کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دل میں کینہ نہیں پالتے تھے۔ کسی بات پر اگر ناراض ہو جاتے تھے تو اُن کا غصّہ تھوڑی دیر ہی رہتا تھا۔ اس کے بعد وہ غصّے والی بات کو بالکل فراموش کر دیتے تھے۔ میرا خیال ہے میرے خلاف انھیں جو شکایت رہی ہو گی وہ بہت جلد ان کے دل سے فراموش ہو گئی ہو گی۔ کم از کم مجھے اس بات کا کبھی گمان نہیں ہوا کہ میرے خلاف مذکورہ شکایت کو وہ اپنے دل میں پالے ہوئے ہیں۔

ابھی میں نے کہا ہے کہ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی کتاب ''رُوحِ اقبال'' کا ذکر میں بعد میں کروں گا وہ بھی سُن لیجیے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان کی کتاب ''رُوحِ اقبال'' کا نیا ایڈیشن چھپا تو مجھے اس کی ایک جلد مکتبہ جامعہ کی طرف سے تبصرے کے لیے ملی۔ میں اُس زمانے میں انڈین پی۔ ای۔ این بمبئی میں The Literary Scene کے زیرِ عنوان اُردو کے بارے میں ہر ماہ باقاعدگی سے لکھا کرتا تھا۔ اس

کتاب کے اکثر مباحث سے اختلاف کے باوجود یہ کتاب مجھے پسند آئی اور میں نے اس پر Indian P.E.N. Bombay میں تبصرہ کیا۔ میں نے اس کتاب کا ذکر جوش صاحب سے بھی کیا۔ اُنھوں نے مجھ سے پڑھنے کے لیے یہ کتاب مانگی اور یہ کتاب اُنھوں نے پوری توجہ سے پڑھی۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ اُنھیں نہ اقبال کی شاعری پسند تھی اور نہ ڈاکٹر یوسف حسین خان کے سے خیالات رکھنے والے لوگ پسند تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے جابجا حواشی سے یہ کتاب پُر کر دی۔ اقبال کا ایک مصرع ہے:

من جواں ساقی تو پیر کہن میکدہ؛

اس کے حاشیے میں لکھا ''اِتنا بھی معلوم نہیں کہ ساقی کی یائے معدود تخفیف میں آرہی ہے'' اقبال پر طنز کرتے ہوئے قوالی ''آہے واہ'' بھی اُنھوں نے اسی زمانے میں کہی تھی۔ اب اتنی مدت کے بعد مُجھے یہ تو یاد نہیں رہا کہ ''رُوحِ اقبال'' پر اُنھوں نے جو حواشی لکھے تھے اُن کی تفصیل کیا تھی لیکن اتنا یاد ہے کہ کتاب کا کوئی صفحہ حواشی سے خالی نہیں تھا۔ یہ حواشی والی کتاب مُجھ سے میرے دوست محمد طفیل مدیر ''نقوش'' نے لے لی تھی۔ معلوم نہیں اس وقت اُن کے ذخیرۂ کُتب میں محفوظ ہے یا کہیں گم ہو گئی۔

☆☆☆☆☆

میں یہ مقالہ طیّارے کے ایک سفر میں لکھ رہا ہوں۔ ظاہر کہ اقتباسات کا اندراج تو گھر واپس پہنچ کے اطمینان سے کروں گا تا کہ اسی سفر کے بعد ہی یہ مقالہ مکمل ہو جائے۔ کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ اس تحریر کے دوران میں نگاہ بار بار مناظر کی طرف جاتی ہے۔ شاید اسی لیے ایک بات جس کا ذکر بہت پہلے آنا چاہیے تھا بھول گیا ہوں وہ یہ کہ جب ''آج کل''، ''بساطِ عالم'' اور ''نونہال'' کا کام ہم لوگوں کے سپرد ہوا تو جوش صاحب سے میں نے کہا کہ ''بساطِ عالم'' کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو کا پیغام آنا چاہیے۔ چنانچہ جوش صاحب نے اُنھیں خط لکھا اور اس میں یہ لکھا کہ اگر آپ کا پیغام نہ ملا یا پیغام ملنے میں دیر ہوئی تو آپ کے ساتھ میری ایسی جنگ چھڑے گی جس کا فیصلہ دُنیا کی کوئی یو۔این۔او نہیں کر سکے گی۔ اس خط کے ملتے ہی پنڈت جواہر لعل نہرو کا

مندرجہ ذیل پیغام آیا:

''کچھ عرصہ سے میں نے ارادہ کیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اخباروں اور رسالوں کو پیغام نہ بھیجا کروں۔ ایسے پیغاموں کی جتنی مانگ آتی ہے اُن کا جواب دینے میں سارا کام رُک سکتا ہے۔ علاوہ اِس کے اخباروں اور رسالوں کو پیغام دینے سے پہلے ان کا امتحان ہونا چاہیے۔ پہلے سے رائے دینا کچھ مناسب معلوم نہیں دیتا۔

لیکن میرے پرانے دوست جوش ملیح آبادی نے اتنا اصرار کیا ہے بلکہ یہاں تک کہ ایک الٹی میٹم دیا ہے لہذا میرے لیے بالکل انکار کرنا مشکل ہوگا۔

ظاہر ہے کہ جو رسالہ جوش صاحب نکال رہے ہیں وہ دلچسپ ہوگا اور شاعرانہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ بہت لوگوں کو نئی دُنیا کے خیالات پہنچائے گا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اس کام میں جوش صاحب کو کامیابی ہوگی۔

جواہر لال نہرو

نئی دہلی، ۲۸ فروری ۱۹۴۸ ''

عرش، بلونت سنگھ اور راقم التحریر نے یہ پیغام دیکھا تو ہمیں دِلی مسرّت ہوئی۔ کچھ دیر کے بعد جب میں اپنے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا یہ پیغام (جو اُردو ہی میں لکھا ہوا تھا) چپراسی لے کر میرے کمرے میں آیا اور یہ پیغام میرے حوالے کیا۔ اس کے ساتھ جوش صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک سلپ تھی جس میں یہ لکھا تھا:

ترجمہ کر کے حرفِ مدعا کا
بھیج دیجے پیام نہرو کا

میں نے اِس کا انگریزی ترجمہ کر کے جوش صاحب کی خدمت میں روانہ کیا۔ عرش نے اس کی ایک
کاپی ٹائپ کرا کے ڈپٹی ڈائریکٹر کو بھیجی، ڈپٹی ڈائریکٹر نے ڈائریکٹر کو اور ڈائریکٹر نے سکریٹری
انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کو۔ اِس بات کا غلغلہ صرف پبلی کیشنز ڈویژن ہی میں نہیں بلکہ منسٹری میں
بھی مچ گیا کہ جوش صاحب نے اِس طرح کا خط وزیرِ اعظم کو لکھا ہے اور وزیرِ اعظم کا یہ جواب آیا ہے۔

''بساطِ عالم'' کے لیے تو پیغام آ گیا۔ ''آج کل'' کے لیے پیغام کی ضرورت نہیں تھیں۔

دراصل یہ ایک پُرانا جریدہ تھا۔ کچھ مدت بند رہنے کے بعد یہ نئے دور میں دوبارہ شروع ہو
رہا تھا۔ اس کی ادارت عرش کے سپرد تھی۔ عرش نے اُن سے کہا کہ اس میں آپ کے قلم سے ایک
اداریہ ہونا چاہیے۔ جوش نے کہا تھوڑی دیر میں آ کر لے جائیے۔ چنانچہ دس پندرہ منٹ کے بعد ہم
تینوں عرش، بلونت سنگھ اور راقم التحریر کی ''طلبی'' ہوئی۔ جوش صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ اداریے
کے صفحے کے لیے ایک تحریر وہ سپردِ قلم کر چکے تھے۔ وہ اُنھوں نے ہمارے سامنے رکھی اور ہم سے کہا
اس پر دستخط کیجئے۔ چنانچہ ہم سب نے اس تحریر کے نیچے اپنے اپنے دستخط کیے اور وہ تحریر یہ ہے:

''یادش بخیر ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء میں دہلی سے جب
میں نے ''کلیم'' جاری کیا تھا۔ کتنا بلند حوصلہ تھا دِل میں اور کتنا
زبردست سودا تھا سر میں۔ ''کلیم'' کو آسمانِ صحافت کا آفتاب
بناؤں گا۔ اس کا اتنا بلند معیار ہوگا کہ ایشیا اور یورپ دونوں
میں اس کی نظیر نہیں مل سکے گی۔

لیکن چند ہی مہینے گزرنے پائے تھے کہ حوصلے
سرنگوں ہو گئے۔ اوّل اوّل تو صرف درجہ اوّل ہی کے مقالے شائع
کیے گئے پھر درجہ دوم کے مقالے بھی باریاب ہونے لگے اور آخر میں
درجہ سوم کے مضامین بھی چھپنے لگے۔ اناللہ و انا الیہ راجعون!

یہ کیوں ہوا؟ بڑی تلخ داستان ہے۔ یہاں

لکھے پڑھے ہی ماشا اللہ کتنے ہیں، اور جو لکھے پڑھے ہیں ان کا
مبلغ علم و ذوقِ ادب کیا ہے اور دو چار معیاری لکھنے والے ہیں وہ
عزت و آسودگی کی زندگی سے کس قدر ہولناک فاصلے پر عمر کی تلخ
گھڑیاں گزار رہے ہیں۔ شرم آتی ہے ان باتوں کے بیان کرنے سے۔

اس لیے میں ''آج کل'' کے باب میں بڑی
بڑی اُمیدیں نہ دلاؤں، اور بلند آہنگی کے ساتھ بڑے بڑے
دعوے نہ کروں تو معذور سمجھ کر مجھے معاف فرمایا جائے۔

ہر چند جہاں تک انسانی مساعی کا تعلق ہے ہر
ممکن سعی کی جائے گی کہ معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں سے
''آج کل'' کم سے کم ہندوستان کا بہترین جریدہ ثابت ہو لیکن
مندرجہ بالا ''چند سطریں'' بہ ثباتِ ''عقل و ہوش'' اس لیے لکھ دی
ہیں کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آوے۔

گواہ شد — عرش
گواہ شد — آزاد
گواہ شد — بلونت سنگھ
راقم — جوش

مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۴۸ء
بمقام دہلی تحصیل و پرگنہ دہلی''

جوش صاحب کے ساتھ ہی ہم تینوں نے اس تحریر پر دستخط کر دیے۔

یہ تحریر ۱۹۴۸ء کی ہے اور آج ۲۰۰۳ء میں یہ مقالہ میں اپنی کتاب ''اپنی محفل اپنے دوست''
میں شمولیت کے لئے بھیج رہا ہوں تو یہ بھی کسی کا شاید مصرع میرے حافظے میں گونج رہا ہے:

''یاد نہ کر دلِ حزیں بھولی ہوئی کہانیاں''

جگن ناتھ آزاد
۱۴ر جون ۲۰۰۳ء

مالک رام

وید بھگوان میں ایک دُعائیہ منتر ہے:

''اے خداوندِ قدیر! مجھے ایک ایسے عالم کی صحبت عطا کر جو اپنے علم وفضل سے (صحیح راستے کی جانب) میری رہ نمائی کر سکے اور جو مجھ پر حق وصداقت کا انکشاف کرے۔''

(رگ ۶-۵۴-۱)

یہ دُعا غالباً میرے لبوں پر تو کبھی نہیں آئی تھی لیکن دل کی گہرائیوں میں ضرور مچلتی رہی ہوگی اور شاید اسی خاموش دُعا کا اثر ہوگا کہ میری خوش قسمتی مجھے مالک رام صاحب کے قریب تر لے گئی اور اس طرح کہ خوردی و بزرگی کے رشتے کے باوجود ہم دونوں میں بے تکلف مراسم پیدا ہوگئے اور ان بے تکلف مراسم نے انجام کار کچھ مدّت کے لیے اُستادی شاگردی کے رشتے کی صُورت اختیار کر لی۔

لیکن اُستادی شاگردی کچھ مدّت کے لیے نہیں ہوتی۔ یہ رُوحانی رشتہ ہے اور ایک بار

شروع ہو کر ٹوٹتا نہیں ہے اس لیے مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ اُستادی شاگردی کا رشتہ کچھ مدّت کے لیے پیدا ہوگیا۔ مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ اُستادی شاگردی کا باضابطہ تعلق چند دن سے آگے نہ بڑھ سکا لیکن باضابطہ تعلق سے پہلے بھی اور بعد میں بھی مَیں نے مالک رام صاحب کی زبان، ادب اور تحقیق میں اُستادانہ حیثیت کو ہمیشہ تسلیم کیا ہے اور ان کی بات کو اسی توجہ سے سُنا ہے، جس توجہ سے ایک شاگرد کو سننا چاہیے۔

باضابطہ درس وتدریس کی بات یہ ہے کہ غالباً ۱۹۶۲ء میں' میں نے قرآن شریف پڑھنے کا عزم کیا۔ ظاہر ہے کہ مالک رام سے بہتر قرآن شریف پڑھانے والا کہاں سے میسّر آتا۔ میں نے اُن سے درخواست کی اُنھوں نے قبول کر لی گویا

ع - 'پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے'

اُس زمانے میں وہ مولانا آزاد کی تصانیف ''ترجمان القرآن''، ''غبارِ خاطر'' اور ''تذکرہ'' کی ترتیب وحواشی کے کام میں مصروف تھے اور اسی سلسلے میں باقاعدہ ساہتیہ اکیڈمی کے دفتر میں بیٹھا کرتے تھے۔ میں قریب ہی پریس انفارمیشن بیورو میں انفارمیشن آفیسر تھا۔ طے یہ پایا کہ میں لنچ کے اوقات میں اُن کے پاس پہنچ جایا کروں۔ میں نے پابندی کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچنا شروع کیا اور کلامِ پاک پڑھنے کی میری دیرینہ آرزو پوری ہونے لگی۔

اس سلسلے کو چند ہی روز گزرے تھے۔ ایک دن میں آموختہ اُنھیں سنا رہا تھا کہ ان کی میز پر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ ٹیلی فون میرے لیے تھا۔ بتانے والا بتا رہا تھا کہ میرے ایک عزیز کا شدید حادثہ ہوگیا ہے۔ وہ سڑک پار کر رہے تھے کہ ایک تیز رفتار بس کی جھپٹ میں آگئے، اُنھیں نازک حالت میں ولنگٹن ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔

یہ سنتے ہی میری حواس گم ہوگئے۔ سبق چھوڑ کر میں نے فوراً اسکوٹر پر پاؤں رکھا اور ہسپتال جا پہنچا۔ میرے عزیز کی حالت مخدوش تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ چند ماہ کے علاج کے بعد وہ صحت یاب ہوگئے لیکن کلام پاک کی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع نہ ہو سکا۔

اس ضمن میں جو بات مجھے آج تک متاثر کر رہی ہے اور جس پر میں آج تک عمل پیرا ہوں یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے سورۂ فاتحہ شروع کرانے سے قبل ہی مجھے قرآن شریف کو ہاتھوں میں اُٹھانے اور میز پر رکھنے کے آداب سے آشنا کیا۔ کلام پاک کا احترام تو مجھے ابتداء ہی سے گھر میں سکھایا گیا تھا لیکن مالک رام صاحب نے میری تعلیمِ قرآن کی ابتداء اس احترام سے کی اور سورۂ فاتحہ پڑھانے سے قبل ہی مجھے رُوحِ مذہب سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مالک رام صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی، ''آج کل'' کے دفتر میں، جوش صاحب کے کمرے میں۔ ایک رات قبل ایک جگہ شعراء کی دعوت تھی، دعوت رات کے بارہ ایک بجے ختم ہوئی تو میں نے جوش صاحب سے کہا کہ مجھے صبح عدالت میں ایک گواہی کے سلسلے میں پیش ہونا ہے۔ ''شاہراہ'' کے مالک یوسف جامعی اور ایڈیٹر پرکاش پنڈت پر ممتاز شیریں کی ایک کہانی کے سلسلے میں ایک صاحب نے مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ مجھے یوسف جامعی اور پرکاش پنڈت کی طرف سے پیش ہونا ہے اس لیے میں کل وقت پر دفتر نہیں پہنچ سکوں گا۔ شاید ایک ڈیڑھ بجے حاضر ہو سکوں گا۔

میں جب خاصی تاخیر سے دفتر پہنچا تو سوچا پہلے جوش صاحب کے کمرے میں پہنچ کر اُنھیں اپنی آمد کی اطلاع دے دُوں۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ حسبِ دستور محفل جمی ہے۔ میں شاید دُعا سلام کے فوراً بعد ہی جوش صاحب سے مخاطب ہوا اور بولا کہ عدالت میں بہت دیر ہو گئی۔ مقدمے کی سماعت ہی بارہ بجے شروع ہوئی۔ میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ایک صاحب جن سے میری کوئی شناسائی نہیں تھی اور جنھیں میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا، جھٹ سے بول اُٹھے، یہ عدالت وغیرہ کا بہانہ آپ کیوں کرتے ہیں؟ جب رات کو بارہ بارہ ایک ایک بجے تک شراب کی محفلیں رہیں گی تو وقت پر دفتر آنا کیسے ممکن ہو سکے گا۔ میں ایک اجنبی کے منہ سے یہ تبصرہ سنتے ہی بھنا گیا۔ جلدی میں مجھ سے جواب نہ بن پایا۔ اتنے میں جوش صاحب نے قہقہہ لگایا اور بولے

''بھئی یہ مالک رام ہیں''۔ مالک رام کا نام سنتے ہی میں اُچھل پڑا اور اُنھوں نے اُٹھ کر فوراً مجھے گلے سے لگا لیا۔

اس ملاقات میں یہ پتہ چلا کہ مالک رام صرف ایک دو دن کے لیے مصر سے آئے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ مصر کوئی غازی آباد یا میرٹھ تو ہے نہیں کہ آپ ایک دن کے لیے دہلی آئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی میٹنگ کے سلسلے میں آئے ہیں اور کل یا پرسوں واپس چلے جائیں گے۔ چنانچہ یہ ملاقات یہیں تک محدود رہی۔

۱۹۶۲ء میں مجھے انگلستان اور یورپ کا سفر درپیش آیا۔ مالک رام صاحب بہ سلسلہء ملازمت اُس زمانے میں بلجیئم کے دارالحکومت برسلز میں تھے۔ میں نے اُنھیں قبل از وقت اطلاع دی اور جب لندن میں' میں اپنے کام سے فارغ ہو گیا تو مالک رام صاحب کے ساتھ طے شدہ پروگرام کے مطابق میں نے برسلز کا رُخ کیا۔ وہاں اُن کے ساتھ جو چند روز بسر ہوئے وہ یورپ کے سفر کا حاصل تھا۔

غالباً اُس زمانے میں مالک رام صاحب ''گُلِ رعنا'' کے حواشی لکھ رہے تھے۔ رات کے نو بجے' دس گیارہ بجے تک میرے ساتھ اُن کی خوش گپیاں رہتی تھیں اور اس کے بعد جب میں سو جاتا تھا وہ اپنا علمی اور تحقیقی کام شروع کرتے تھے۔ ان کے محنت کرنے کی یہ عادت آج بھی اسی طرح جاری ہے اور اُنھیں مصروفِ کار دیکھ کر یورپین محققین اور مستشرقین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ رات کو کھانے کے بعد ہم دونوں بلجیئم کی سڑکوں پر گشت کر رہے تھے۔ بات چیت کے دوران میں' میں نے حافظ کا یہ مصرع پڑھا:

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

مالک رام صاحب یہ مصرع سنتے ہی سوچ میں پڑ گئے اور قدرے توقف کے بعد بولے ''غالباً'' ''مو بتراشد'' ہے۔ اب اس کے بعد میں بھی یقین سے کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے اتنا ہی کہا کہ میں

نے شاید "سر بتراشد" ہی پڑھا ہے۔" ممکن ہے غلط پڑھا ہو۔ ویسے اقبالؔ نے بھی اس مصرعے کو اپنایا ہے تو یوں:

اگرچہ سر بتراشد قلندری داند

بات آئی گئی ہوگئی، کوئی چند ماہ کی سیاحت کے بعد میں وطن واپس آیا۔ اس دوران میں مالک رام صاحب کے ساتھ باقاعدہ قسم کی خط وکتابت شروع ہو چکی تھی۔ ان کا ایک خط مجھے یورپ سے واپسی کے قریباً ایک برس بعد ملا۔ اس میں لکھا تھا آپ کو یاد ہوگا بلجیم میں ایک رات دوران گفتگو میں حافظ کے ایک مصرعے پر بات ہوئی تھی۔ آپ نے مصرع صحیح پڑھا تھا۔ اس میں "مو بتراشد" نہیں ہے "سر بتراشد" ہے۔ میری حیرت کی حد نہ رہی جس بات کو میں ایک وقتی بات سمجھ کر بھلا چکا تھا، وہ مالک رام صاحب کے لیے موضوعِ تحقیق بن گئی اور جب تک اس کے متعلق اُنھوں نے پوری تحقیق نہ کر لی انھیں چین نہ آیا۔

اسی دورانِ قیام میں، میں نے مالک رام صاحب کے یہاں ایک عجیب وغریب چیز دیکھی اور یہ ایک آٹوگراف چارٹ تھا۔ آٹوگراف بک تو ہم سب نے دیکھی ہوگی۔ لیکن یہ آٹوگراف چارٹ میرے لیے ایک عجیب وغریب چیز تھا۔ جیسے دُنیا کا نقشہ دو ڈنڈیوں اور ایک رسی کے سہارے دیوار پر لٹکا رہتا ہے۔ اُسی طرح یہ آٹوگراف چارٹ اُن کے ڈرائنگ روم میں لٹکا رہتا تھا اور اس پر دُنیا بھر کے ادیبوں کے دستخط موجود تھے۔ کسی کا صرف دستخط تھا۔ کسی کا شعر سمیت دستخط۔ کسی نے کوئی جملہ لکھا تھا، کسی نے کوئی مقولہ، غرض یہ چارٹ ایک ہی نظر میں عجب بوقلمونی کیفیت پیش کر رہا تھا۔ میری واپس انگلستان روانگی سے ایک رات قبل مالک رام صاحب نے یہ چارٹ میرے سامنے رکھا اور مجھ سے اس پر آٹوگراف دینے کو کہا۔ میں نے پنجابی کے ایک شاعر کا مندرجہ ذیل شعر لکھ کر اپنے دستخط کر دیئے:

"الف اج دی رات وصال والی بھلکے کی جاناں کیڑھا رنگ ہوسی
میلے فیر محمد اقسمتاں دے کتھے شمع تے کتھے پتنگ ہوسی"

دراصل اُس رات مالک رام صاحب سے جدا ہوتے وقت میرے دل کی کیفیت یہی تھی اور جب مجھے ایک حسب حال شعر یاد آگیا تو میں نے اُسے آٹوگراف چارٹ پر لکھ دینا مناسب سمجھا۔

معلوم نہیں یہ آٹوگراف چارٹ اب مالک رام صاحب کے پاس ہے یا نہیں کیونکہ اگر یہ کھو گیا ہے تو اس پر کیے ہوئے پطرس بخاری، آرتھر آربری، سر ظفر اللہ خان، ایساندر بسانی، جولیس جرمینوس اور انا میری شمل کے دستخط یا آٹوگراف بھی گم ہو چکے ہیں۔

میرے اس قیامِ برسلز کی ایک اور رات بھی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی اور یہ وہ رات تھی جب مالک رام صاحب نے اپنے گھر میں محفل شعر کا اہتمام کیا۔ اُردو شاعری کی محفل اور برسلز میں، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہندوستان یا پاکستان کے کسی شہر میں بیٹھا ہوں۔ ہندوستانی اور پاکستانی سفارت خانے کے اکثر وبیشتر لوگ اُس محفل میں موجود تھے۔ غالباً دونوں ملکوں کے سفیر بھی تھے۔ اس وقت بلجیم میں ہمارے سفیر تھے کے. بی. لال اور پاکستان کے سفیر تھے جنرل محمد ایوب خاں کے بھائی، نام اُن کا مجھے یاد نہیں رہا۔ شاعر صرف مَیں تھا۔ اس لیے میں نے جی بھر کے کلام سنایا اور سننے والوں نے بھی جی بھر کے سنا کہ ایک مدّت کے بعد انھیں ایک اُردو شاعر کا کلام سننے کا موقع مل رہا تھا۔ دیارِ فرنگ میں رات کے کوئی دو بجے تک یہ محفل جمی رہی۔

قیام برسلز کے دوران ہی میں مالک رام صاحب کے مشورے کے مطابق میں نے ہالینڈ، لکسمبرگ، جرمنی اور فرانس کی ایک جھلک دیکھنے کا پروگرام بنالیا۔ ایک دن تو ایسا ہوا کہ میں صبح برسلز سے چلا اور رات تک ہالینڈ کی سیر کر کے واپس آگیا۔ اسی طرح چند روز ان کے ساتھ گزارنے کے بعد میں پھر انگلستان واپس چلا گیا۔

آخر جب وطن واپس آنے کا پروگرام طے ہوا تو میں نے پھر برسلز کا رستہ اختیار کیا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک تو مالک رام صاحب سے ملاقات ایک بار پھر ہو جائے گی، دُوسرا اُن سے سفر ہسپانیہ

کے متعلق ہدایات لے لوں گا کیوں کہ میں وطن واپس لوٹنے سے قبل مسجدِ قُرطبہ کی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ میں اس وقت تک مسجدِ قُرطبہ کو اپنے تصوّر میں کئی بار دیکھ چکا تھا لیکن ایک بار فنِ تعمیر کے اس شاہکار نمونے کو اپنی چشم ظاہر سے دیکھنا چاہتا تھا، جس نے اُردو شاعری کو سب سے بڑا شاہکار دیا تھا۔ زمان و مکان کا وہ پس منظر جس نے "بالِ جبریل" کے صفحات میں سما کر اُردو شاعری کو آسمان تک پہنچا دیا تھا خود کیا شے ہوگی۔ یہ خیال مجھے کشاں کشاں لندن سے بلجیئم اور بلجیئم سے فرانس کے رستے اسپین لے گیا۔

دراصل فرانس کا رُخ کرنا ہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ حرم مرتبت سرزمین کے رستے میں اس صنم کدے نے میری منزل کھوٹی کر دی اور جب میں پیرس کے ریلوے اسٹیشن سے میڈرڈ کے لیے روانہ ہوا تو میرا دل اور جیب دونوں خالی ہو چکے تھے۔ "در ایامِ جوانی چندانکہ افتد دانی" لیکن میں اس تنبیہہ سے بےخبر رہا کہ ؎

حرم کو جانے والے راہ میں ثابت قدم رہنا
حرم والوں کے رستے میں صنم خانے بھی آتے ہیں

فرانس میں میرے قدم جس طرح سے لڑکھڑائے اس پر میں حیران تو نہیں ہوں لیکن پشیمان ضرور ہوں۔ اِدھر شانزے لیزے تھا اُدھر قالی برژے۔ اُن سے منہ موڑا تو لیڈو اور سیکسی راما نے راستہ روک لیا۔ جس طرف قدم اُٹھاتا تھا یہی منزلیں سامنے آتی تھیں۔ اَب اس کے سوا اور کیا کہوں کہ ؎

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دَور
نکلے جو میکدے سے تو دُنیا بدل گئی

لیکن سرتاپا اس ہوش رُبا ماحول میں ملوث ہونے کے باوجود مسجدِ قُرطبہ کی زیارت کی آرزو سے دل بیگانہ نہ ہوا اور میں پیرس سے میڈرڈ اور میڈرڈ سے قُرطبہ جا پہنچا۔ قُرطبہ سے میں نے مالک رام کو تار دیا کہ اس وقت صورت یہ ہے کہ روٹی کے ساتھ پیاز کے سوا اور کچھ خریدنے کی سکت

نہیں ہے کہ اسپین میں کھانے کی یہی جنس سب سے ارزاں ہے۔ جوں توں کر کے قُرطبہ، طلیطہ، اشبیلیہ، مدینۃ الزہرا، غرناطہ اور مُرسیہ وغیرہ کا سفر تو کر لوں گا اور یہاں پر میرا کوئی مستقل پتہ بھی نہیں اور یہاں سے مارسیلز کا ٹکٹ بھی میرے پاس ہے اس لیے آپ میسجریز میری ٹائمز کے پتے پر میرے لیے کچھ روپیہ مارسیلز بھیج دیجیے۔

مارسیلز پہنچتے پہنچتے میری یہ حالت ہوگئی تھی کہ ریلوے اسٹیشن سے میسجریز میری ٹائمز کے دفتر تک جو چار پانچ میل کا فاصلہ ہوگا میرے لیے پیدل جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہاں پہنچا تو بھوک سے جان لبوں پر آرہی تھی۔ پہنچتے ہی اپنا نام پتہ بتایا' ریسپشنسٹ نے مژدۂ جانفزا دیا کہ برسیلز سے مالک رام صاحب نے آپ کے لیے منی آرڈر سے روپیہ بھیجا ہے۔ مجھے اب یاد نہیں کتنا روپیہ تھا لیکن میری ضرورت سے کہیں زیادہ تھا۔ میں نے روپیہ لیا۔ سیدھا ایک ریسٹورنٹ میں پہنچا۔ پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ ٹیکسی لی۔ اسٹیشن پر آیا۔ اپنا سامان اُٹھایا اور ایک ہوٹل میں جا کر فروکش ہوگیا۔ دُوسری صبح کو مجھے ہندوستان روانہ ہونا تھا۔ اُس روز کئی دنوں کے بعد مجھے پیٹ بھر کے کھانا نصیب ہوا تھا۔

یہ روپیہ تو ہندوستان واپس آ کر میں نے اُن کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا دیا لیکن اس کے بعد مالک رام صاحب سے جب بھی میں نے اس واقعے کا ذکر کیا اُنھوں نے سُنی اَن سُنی کر دی کہ شاید میں اس بیانِ واقعہ کے ذریعے سے شکریہ ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ان کے قیامِ یورپ کا ایک اور واقعہ مجھے یاد آرہا ہے جس کا تانا بانا ہندوستان میں بُنا گیا۔ مالک رام بہ سلسلہ ملازمت جب یورپ گئے تو اپنا ذاتی ذخیرۂ کتب جو ہزاروں نادر اور کمیاب کتابوں پر مشتمل تھا دوار کا داس شعلہ کی تحویل میں دے گئے۔ ایک دن پنڈت ہری چند اختر، عرش ملسیانی اور میرے درمیان یہ سازش ہوئی کہ اختر، عرش اور میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مالک رام صاحب کو یورپ خط لکھیں کہ فارسی کی فلاں کتاب جس پر آپ کا نام لکھا ہے آج

مجھے جامع مسجد قریب بازار کے ایک کباڑی کے یہاں ملی۔ معلوم نہیں وہاں کیسے پہنچ گئی۔ ہمارا خیال تھا کہ جب پانچ سات کتابوں کے بارے میں اس قسم کے دو تین خط مالک رام صاحب کو ملیں گے تو وہ پریشان ہو اٹھیں گے اور اسی عالم میں دوارکا داس شعلہ کے نام خطوط کا تانتا باندھ دیں گے کہ میری کتابوں کا یہ کیا حشر ہو رہا ہے۔ لیکن بد قسمتی یہ ہوئی کہ جب ہم لوگوں میں یہ سازش پک رہی تھی تو رحمت قطبی بھی وہاں موجود تھے۔ ابھی ہم تو خط لکھنے کی سوچ رہے تھے کہ رحمت قطبی نے مجوزہ مضمون کا ایک خط مالک رام کے نام داغ دیا۔ مالک رام کی ذہانت کی داد نہیں دی جا سکتی۔ اُنھوں نے فوراً عرش کو خط لکھا کہ آپ، اختر یا آزاد کی طرف سے اس قسم کا خط آئے تو اس کے کوئی معنی بھی ہیں، یہ رحمت قطبی کون ہے ایسے خط لکھنے والا۔

مالک رام صاحب اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے سے قبل برسلز سے دہلی آ گئے تھے۔ میرا قیام بھی اُس زمانے میں دہلی میں تھا۔ ان کی ریل جب بمبئی سے دہلی پہنچی تو اسٹیشن پر اُن کے احباب کا ایک ہجوم استقبال کے لیے موجود تھا۔ دوارکا داس شعلہ، عرش ملسیانی، راقم التحریر ہم سب اُس ہجوم میں گم تھے۔ دوارکا داس شعلہ نے قرول باغ میں اُن کے لیے پہلے ہی مکان کا انتظام کر رکھا تھا۔ مالک رام اپنے بیوی بچوں سمیت اس مکان میں فروکش ہوئے اور ان کے ساتھ میری ملاقاتوں کا ازسرِ نو ایک سلسلہ شروع ہوا۔ میں اور والدِ محترم اکثر اُن کے گھر جاتے تھے اور گھنٹوں وہاں بیٹھتے تھے۔ اسی طرح مالک رام بھی ہمارے یہاں آتے اور خاصی دیر تک علمی گپ چلتی۔ والدِ محترم کا موزوں کیا ہوا یہ قطعہ اُسی زمانے کی یادگار ہے۔

کون مالک رام سا ہر دلعزیز ہند سے تا روم و مصر و شام ہے
مذہب و ملت کے جھگڑوں سے الگ سچ تو یہ ہے سب کا مالک رام ہے

مالک رام کے دل میں نیکی اور شرافت کا جو جذبہ موجود ہے اس پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ وہ ہر ضرورت مند کی مدد کے لیے تیا تے ہیں۔ اپنی سرکاری

حیثیت میں بھی اُنھوں نے اپنی اس خوبی سے کتنوں کے مسائل حل کیے اور ان کے دل مٹھی میں کر لیے۔

میں جس زمانے میں پریس انفارمیشن بیورو میں انفارمیشن آفیسر تھا، میرے عزیز دوست صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی 'ایڈیٹر' ''پیامِ مشرق'' (ہفتہ وار) اور ''آستانہ'' (ماہانہ) نے ایک دن دورانِ ملازمت میں مجھ سے کہا کہ اس سال مجھے اپنے جرائد کے لیے اتنے ٹن کاغذ کی منظوری ملی ہے لیکن حقیقتاً کاغذ اس سے بہت کم ملا ہے اور میرے لیے ''پیامِ مشرق'' اور ''آستانہ'' کو مطلوبہ تعداد میں چھاپنا دشوار ہو گیا ہے۔ بڑی مشکل میں گرفتار ہوں، کیا کیا جائے۔ میں نے کہا میرے دوست مالک رام منسٹری آف کامرس میں افسر ہیں۔ یہ تو نہیں معلوم کہ اُن کا عہدہ کیا ہے لیکن میں اُن کے نام پرچہ لکھ دیتا ہوں، اُن سے جس حد تک ہو سکے گا مدد کریں گے چنانچہ وہ میرا پرچہ لے کر مالک رام صاحب کے پاس گئے۔

مالک رام صاحب نے اُن کی فائل منگوائی اور ساری فائل کا اوّل سے آخر تک مطالعہ کرنے کے بعد اُن سے کہا غالباً آپ کو گزشتہ برس بھی کاغذ پوری مقدار میں نہیں ملا۔ فاروقی صاحب صورتِ حال سے خاصے مایوس تھے۔ بولے ہاں یہ صحیح ہے لیکن چھوڑیئے گزشتہ برس کے کاغذ کو، مُجھے اس سال کا بقیہ کوٹا مل جائے تو بڑی بات ہے۔ مالک رام صاحب نے کہا جب گزشتہ برس کے کاغذ پر آپ کا حق ہے تو آپ اسے کیوں چھوڑ رہے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کو گزشتہ برس کا کاغذ بھی مل جائے۔ چنانچہ مالک رام صاحب نے اس فائل پر جو نوٹ لکھے ان کے نتیجے کے طور پر مستحسن فاروقی کو سالِ رواں کے بقیہ کاغذ کے ساتھ گزشتہ برس کا بقیہ کوٹا بھی مل گیا۔ فاروقی صاحب کو جب اس بات کی منظوری کا کاغذ پہنچا اور ساتھ ہی وہ پروانہ بھی جس کی بنا پر وہ کاغذ کا پورا کوٹا حاصل کر سکتے تھے، تو بہت خوش ہوئے اور اسی خوشی کے عالم میں اُنھوں نے میرے دفتر کا رُخ کیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی انھوں نے بے اختیارانہ انداز میں کہا' یار جگن ناتھ! مالک رام تو تم سے بھی زیادہ اچھا آدمی ہے۔ کمرے میں چند اور احباب بھی موجود تھے۔ اس جملے پر سب نے ایک قہقہہ لگایا اور جب میں نے اس جملے کی تشریح پوچھی تو فاروقی صاحب نے سارا واقعہ اوّل سے آخر تک کہہ سنایا کہ میرے کاغذ والے معاملے کی ڈوبی ہوئی کشتی مالک رام کی توجہ سے اُبھر آئی ہے۔ ساتھ ہی فاروقی صاحب نے یہ بھی کہا کہ اس زحمت کے لیے جب میں اُن کا شکریہ ادا کرنے گیا تو وہ بولے اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ اپنا دفتری کام تن دہی سے کرنا تو ہم لوگوں کے فرائض میں داخل ہے۔

مالک رام مزاجاً جلوت پسند بھی ہیں اور خلوت پسند بھی۔ علمی اور تحقیقی کام ان کا اوڑھنا بچھونا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کا یہ کام تنہائی اور گوشہ نشینی ہی میں سرانجام پاتا ہے۔ اس چھوٹے سے مقالے میں اُن کے تحقیقی اور علمی کاموں کا جائزہ لینا مقصود نہیں۔ اس موضوع پر عرش ملسیانی ایک سیر حاصل مقالہ لکھ چکے ہیں۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کبھی کبھار جب آپ اس گوشۂ تنہائی سے فراغت پانا چاہتے ہیں تو اپنے گھر ہی پر دوستوں کی محفل سجا لیتے ہیں۔ کبھی چائے پر، کبھی کھانے پر۔ کبھی یہ محفل بزمِ مذاکرہ ہوتی ہے اور کبھی بزمِ مشاعرہ اور اس کے بعد آپ پھر علمی مراقبے میں چلے جاتے ہیں اور وقار انبالوی کے اس مصرعے کی تفسیر بن جاتے ہیں۔

ع - رات، تنہائی، قلم، کاغذ، وقار

یہی قلم اور کاغذ ہی ان کی متاعِ گراں بہا ہے جس کی بدولت علم کے خزانوں میں اُنھوں نے اضافہ کیا، دُور دُور تک ان کا نام پہنچا اور ان کی عظمت کا ڈنکا بجا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اُن کی کتاب "اسلام میں عورت کا مرتبہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ مصنف کا علمِ حدیث تبصرہ نگار سے کہیں زیادہ ہے۔ ابھی پچھلے دنوں جب اقبال عالمی کانگرس میں شرکت کے لیے میں لاہور گیا تو نہ جانے کتنے لوگوں نے مالک رام صاحب کے کانگریس میں شریک

نہ ہونے کی وجہ پوچھی۔ میں نے شروع میں غلطی سے سچ کہہ دیا کہ ڈاکٹر نے آنے کی اجازت نہیں دی۔ بس پھر کیا تھا۔ پاکستان کے ایک ایک ادیب نے میرے کمرے کا رُخ کیا اور مجھ سے ان کی خیریت پوچھی۔ میں بتاتے بتاتے تھک گیا کہ بھئی خدا کے فضل سے بخیریت ہیں۔ تشویش کی کوئی بات نہیں ڈاکٹر نے صرف اس بنا پر شرکت کی اجازت نہیں دی کہ اس موقعے پر بڑی بڑی دعوتیں ہوں گی، صبح سے شام تک اجلاس جاری رہیں گے' ان دعوتوں اور تھکن سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ لاہور کا رُخ ہی نہ کیا جائے۔

لیکن جب ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، جسٹس رحمٰن، ڈاکٹر جاوید اقبال، خواجہ عبدالوحید، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، سیّد عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر معزالدین، محمد طفیل، پروفیسر محمد عثمان، ابوالخیر کشفی، عبدالسلام خورشید اور ان کے علاوہ متعدد پاکستانی ادیبوں نے ان کی خیریت پوچھی تو مُجھے بڑی چِڑ ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں تو خود بزعمِ خویش اس کانگریس میں ہیرو بنا پھرتا ہوں، مجھ سے زیادہ مقبولیت تو پاکستان میں ان حضرت کو حاصل ہے جو کانگریس میں شریک ہی نہیں ہوئے۔

لیکن مالک رام اپنی اس علمی شان وشوکت سے قطعاً بے خبر اور بے تعلق ہیں۔ وہ اپنے کام میں اتنے مگن ہیں کہ تعریف سے بھی بے نیاز ہیں اور مذمت سے بھی بے نیاز۔ اُنھوں نے جو بھی کام کیا اسے ایک معیاری درجہ حاصل رہا۔ آج ۱۹۷۸ء میں تو ان کی حیثیت مسلمہ طور پر ایک بین الاقوامی اہلِ قلم کی ہے۔ ۱۹۳۳ء میں جب اُن کے نام سے بہت کم لوگ آشنا تھے اُنھوں نے ڈاکٹر نکلسن کے اُس مقالے کا اُردو میں ترجمہ کیا جو نکلسن نے "اسرارِ خودی" کے متعلق لکھا تھا۔ ترجمے کے ساتھ مالک رام نے اسے حواشی سے بھی مزین کیا۔ حواشی سمیت یہ ترجمہ "نیرنگِ خیال" کے اقبال نمبر میں شائع ہوا اور جب یہ ترجمہ علامہ اقبال کی نظر سے گزرا تو اُنھوں نے اسے اس قدر پسند کیا کہ اُنھوں نے مترجم کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور اقبال کی یہ خواہش مالک رام کی اقبال کے ساتھ پہلی

ملاقات کا سبب بنی۔

مالک رام کا خاص موضوع غالب ہے۔ اقبال پر اُنھوں نے زیادہ نہیں لکھا لیکن اقبال کے متعلق جب بھی میری ان کے ساتھ گفتگو ہوئی ہے میں نے اُنھیں بحرِ اقبالیات کا شناور پایا ہے۔ اُنھوں نے اقبالیات کے تعلق سے کئی موقعوں پر میری مشکلات کو آسان کیا۔

آج جب کہ اقبال کی اَز سرِ نو دریافت کے ساتھ ہندوستان میں اقبال شکنی کی مہم بھی شروع ہے، صحیح اقبال شناسی کا کام مالک رام کے قلم کا منتظر ہے۔ شاید اسی خیال کے تحت جب میں نے اپنی کتاب ''اقبال اور کشمیر'' کا اِنتساب مالک رام صاحب کے نامِ نامی سے کیا تو اقبال کا یہ شعر بے ساختہ میرے احساس میں چمکا اور میں نے اسے اِنتساب کے ساتھ ہی عنوانِ داستان بنایا۔

بیا کہ دامنِ اقبال را بدست آریم
کہ او ز خرقہ فروشانِ خانقاہے نیست

ڈاکٹر خلیق انجم

ڈاکٹر خلیق انجم نے ایک مضمون میں اپنے متعلق کچھ اس طرح کی بات لکھی ہے کہ میں سڑک کا آدمی ہوں......جامع مسجد کے قریب ڈاک خانے کے نیچے بیٹھ کر خط لکھا کرتا تھا........

۱۹۴۷ء میں بارہ برس کی عمر میں والد کا انتقال ہوگیا.........

کسرِ نفسی یقیناً ایک خوبی ہے لیکن ڈاک خانے کے نیچے بیٹھ کر خط لکھنے سے کوئی شخص سڑک کا آدمی نہیں بن جاتا۔ خدا کی رحمتوں کے پہلو حد وشمار سے باہر ہیں۔ کسی فرد کی تخلیقی صلاحیتوں کے سرچشمے کہاں کہاں واقع ہیں اس کا بعض اوقات ان سرچشموں سے مستفید ہونے والی شخصیتوں کو علم بھی نہیں ہوتا۔ بزرگوں کی دُعائیں یا اپنے بزرگانِ خاندان میں کسی عالم کی موجودگی کس طرح ہمیں متاثر کرتی ہے اور کس طرح بعد میں آنے والے بچوں کی علمی یا ادبی یا خالص تخلیقی صلاحیتوں پر اثر انداز ہوتی ہے یہ خدائی راز ہیں جو ہم لوگوں کی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں ایک زندہ و پائندہ حقیقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم کے نانا پروفیسر عزیز الرحمٰن ایک مستند عالم تھے۔ اُردو انگریزی دونوں زبانوں پر اُنھیں عبور حاصل تھا۔ اُردو میں اُنھوں نے سات جلدوں پر مشتمل ''علمِ مجلسی'' نام کی

کتاب لکھی اور انگریزی میں دہلی کی جامع مسجد پر ایک کتاب تحریر کی جسے اس موضوع پر آج بھی استناد کا درجہ حاصل ہے۔ خلیق انجم کے والد ریلوے میں انجینئر تھے۔ گویا خاندان میں اُدب اور علم (لٹریچر اور سائنس) دونوں موجود تھے۔ خاندان میں آنے والی نئی نسل کا اُن سے متاثر ہونا یا نئی نسل کے ایک فرد یا زیادہ افراد کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ادب اور علم کی اس موجودگی کا مثبت رول ادا کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔

ڈاک خانے کے نیچے بیٹھ کر خط لکھنا بھی مصلحتِ ایزدی سے خالی نہیں رہا ہوگا۔ ممکن ہے قدرت خطوط نویسی کی جانب خلیق انجم کے اس رجحانِ طبع کی نشان دہی کر رہی ہو جس کا ایک پہلو بعد میں آکے ''غالب کے خطوط'' کی صورت میں نمودار ہوا اور جس کی چار جلدیں اس وقت اہلِ نظر کے سامنے آچکی ہیں اور پانچویں جلد زیرِ طباعت ہے۔ ''غالب کے خطوط'' ڈاکٹر خلیق انجم کا ایک ایسا شاہکار ہے جس نے ہندوستان کے تمام بالغ نظر نقادوں کو متوجہ کیا ہے اور اُنھوں نے اس کام کو ایک عظیم تدوینی اور تحقیقی کام قرار دیا ہے۔ جمیل الدین عالی نے اس کے متعلق جو ایک کتاب العلوم کی حیثیت رکھتی ہے، لکھا ہے کہ ''غالب کے خطوط'' ایک مثالی نوعیت کا کام ہے اور اس معیار کا کام ہمیں جرمن اُدب میں نظر آتا ہے۔'' جب اس کتاب کی پہلی جلد شائع ہوئی اور راقم التحریر نے اس کا مطالعہ کیا تو اس سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اس سے متعلق اس نے انگریزی میں ایک مضمون لکھا جو ''اقبال ریویو'' (لاہور) اور ''کشمیر ٹائمنز'' (جموں) میں شائع ہوا۔

''غالب کے خطوط'' پر تو کام ڈاکٹر خلیق انجم نے خیر بہت بعد میں آکے کیا۔ تصنیف و تالیف کا کام اُنھوں نے ۱۹۵۷ء میں شروع کر دیا تھا جب کہ وہ ابھی ایم اے کے طالب علم تھے۔ نکولائی گوگول کے ناول ''تاراس بلبا'' کا اُنھوں نے ۱۹۵۷ء ہی میں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ مکتبہ شاہراہ اُردو بازار دہلی کی جانب سے شائع ہوا تھا۔ کچھ مدت بعد اُنھوں نے مرزا مظہر جانِ جاناں کے فارسی خطوط مرتب کیے اور اُردو میں ان کا ترجمہ کیا۔ یہ کتاب ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ ''غالب کی نادر تحریریں'' غالبیات کے سلسلے میں خلیق انجم کی ایک اور کتاب ہے جو

۱۹۶۱ء میں منظرِ عام پر آئی۔ ۱۹۶۵ء میں ''مرزا محمد رفیع سودا'' انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ نے شائع کی۔ اس کتاب کے بارے میں پروفیسر آلِ احمد سرور نے لکھا تھا کہ ''اگر آپ کو یہ دیکھنا ہو کہ اُردو میں تحقیق کس اعلا معیار پر پہنچ گئی ہے تو اس کتاب کا مطالعہ کیجیے۔''

یہاں اس مضمون میں ڈاکٹر خلیق انجم کی تمام تصنیفات اور تالیفات کا ذکر کرنا میرا مقصد نہیں ہے۔ اگرچہ ان تصنیفات و تالیفات کی تعداد تیس اکتیس تک پہنچی ہے لیکن یہاں کتابوں کا ذکر محض ضمنی طور پر آگیا ہے۔ کہنا تو میں یہ چاہتا تھا کہ نکولائی گوگول کے ناول ''تاراس بلبا'' کے ترجمے سے بھی بہت پہلے علم و ادب خلیق انجم کا اوڑھنا بچھونا بن چکا تھا۔

۵۵-۱۹۵۴ء کی بات ہے یا شاید اس سے بھی کچھ پہلے کی۔ انجمن تعمیر اُردو کے ایک جلسے میں خلیق انجم نے اصغر گونڈوی کی شاعری پر ایک مقالہ پڑھا۔ چند روز قبل مولانا آزاد پر ان کا ایک مضمون میں دیکھ چکا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم پر اس تحریر سے میں کچھ متاثر نہیں ہوا تھا اور اب جو چند روز بعد اصغر گونڈوی کی شاعری پر اتنا مدلل اور متوازن مقالہ سنا تو میری مسرت کی انتہا نہ رہی اور میں نے غالباً دس بارہ روز تک اس مضمون سے متعلق اپنے حلقۂ احباب میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا۔

خلیق انجم کے ساتھ اگرچہ ملاقاتیں اس سے قبل بھی انجمن تعمیر اُردو کے جلسوں میں ہو چکی تھیں اور غالباً انجمن ترقی اُردو (ہند) شاخ دہلی کے اجلاس میں بھی لیکن اس جلسے نے یا دوسرے لفظوں میں خلیق انجم کے مقالے نے ہمیں ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا اور عمر میں ۱۷-۱۸ برس کا فرق ہونے کے باوجود دونوں میں دوستی کا ایک ایسا رشتہ قائم ہوا جو خدا کے فضل سے آج تک برقرار چلا آرہا ہے۔

ان دونوں انجمنوں میں مقالات، نظموں، غزلوں اور کہانیوں کے بعد کبھی کبھار بحث و مباحثہ شروع ہو جایا کرتا تھا۔ بحث میں حصہ لینے والے حضرات میں علامہ برج موہن دتاتریا کیفی، محمد اجمل خاں، گوپی ناتھ امن اور مالک رام بھی اکثر شامل ہوتے تھے۔ گوپال متل،

غلام ربانی تاباں اور غلام احمد فرقت اور ان کے بعد کی نسل کے بھی جن میں شمیم کرہانی، مخمور جالندھری، فکر تونسوی، پرکاش پنڈت، نریش کمار شاد اور راقم التحریر کا نام بھی شامل کیا جا سکتا ہے باقاعدہ ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے بعد کی نسل لڑکوں پر مشتمل تھی اور اس Age Group میں خلیق انجم بھی شامل تھے۔ خلیق انجم کی بحث تمام اہلِ بزم اور اہلِ قلم حضرات کو متاثر کرتی تھی۔ ان کے اندازِ بحث کی خوبی یہ ہوتی تھی کہ وہ مختصر لفظوں میں اپنا مافی الضمیر بیان کر دینے پر قادر تھے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی وجہ سے دو حضرات کی نوک جھونک تلخی کی صورت اختیار کر لیتی تھی اس وقت خلیق انجم اپنے طنز و مزاح کے چھینٹوں سے کام لے کر محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے اور صورتِ حال سنبھل جاتی تھی۔ خلیق انجم کی یہ شگفتہ مزاجی آج بھی باقی ہے اور میں نے اکثر علمی اور ادبی محفلوں میں اور بعض دفعہ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے جلسوں میں بھی یہ دیکھا ہے کہ اگر کسی وجہ سے ماحول میں بدمزگی پیدا ہوئی ہے تو خلیق انجم کی شگفتہ بیانی نے بگڑتی ہوئی بات کو بنا لیا ہے۔ یہ رکھ رکھاؤ خلیق انجم کے مزاج کا ایک حصہ ہے، اس کا جزوِ لاینفک ہے اور ظاہر ہے کہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اور یہ اسی سعادت ہی کے باعث ہے کہ یہ شگفتہ مزاجی کسی مصنوعی یا بناوٹی طرزِ بیاں کا حصہ نہیں ہے بلکہ خود ایک وضعِ زندگی ہے جس کا خمیر صاف دِلی اور بے تکلفی کے اجزاء سے اُٹھا ہے۔ چنانچہ یہ بات اکثر میرے دیکھنے میں آئی ہے کہ خلیق انجم کا رویّہ ہر ایک کے ساتھ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' تکلفات کی آلائش سے پاک ہے۔ یہ بات بظاہر حیرت انگیز نظر آتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ خلیق اپنے دفتر کے چپراسیوں کو بھی وہی عزت دیتے ہیں جو ایک انسان کو دُوسرے انسان کو دینا چاہئے۔ میں نے اُنھیں انجمن کے بعض ملازمین سے ناراض ہوتے بھی دیکھا ہے، اُنھیں غصے کے عالم میں بھی دیکھا ہے لیکن جتنی تیزی سے اُنھیں غصہ آتا ہے اسی تیزی سے فرو بھی ہو جاتا ہے اور اسے ظاہر و باطن کی یکسانیت کی دلیل کہنا غلط نہیں ہوگا۔ پٹھان کا ظاہر و باطن تو یکساں ہونا ہی

چاہیے۔ ویسے بھی ان کے اندازِ گل افشانیِ گفتار کے بارے میں قرۃ العین حیدر کا کہنا ہے کہ ''خلیق انجم بڑی سے بڑی بات کو بھی اس طرح Informal انداز میں کہتا ہے کہ بات دِل میں اُتر جاتی ہے۔'' دراصل خلیق انجم ٹھیٹھ دلّی والا ہے۔ دلّی والے کی خوبی یہ ہے کہ منہ پھٹ ہوتا ہے۔ بات دل میں نہیں رکھتا جو کچھ کہنا ہو سامنے کہہ دیتا ہے۔ اور خلیق انجم تو پٹھان بھی ہے گویا کریلا اور پھر نیم چڑھا۔ اور ہاں' خلیق انجم نوجوانوں میں جوہرِ قابل کی حوصلہ افزائی اور ادب و زندگی کے میدان میں ان کی رہنمائی کو بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ انجمن کے سیمناروں میں وہ ہمیشہ دو یا تین طلبہ کو سامنے لاتے ہیں اور ان نئے طلبہ میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا شمار دیکھتے ہی دیکھتے اہلِ قلم میں ہونے لگا ہے۔

ہاں! تو میں خلیق انجم کے اس مقالے کی بات کر رہا تھا جو انھوں نے انجمن تعمیرِ اُردو کے اجلاس میں پڑھا۔ جب اجلاس ختم ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ بھئی وقت آپ کے پاس ہو تو کبھی کبھار ملاقات ہونا چاہئے۔ چنانچہ ہم نے ایک دُوسرے کو اپنے اپنے پتوں سے آگاہ کیا۔ خلیق انجم اُس زمانے میں دریا گنج والے مکان میں رہتے تھے۔ میں پل بنگش والے مکان میں، دفتر میرا اولڈ سیکریٹریٹ میں تھا پبلی کیشنز ڈویژن میں۔

ہمارے پل بنگش والے مکان کی کہانی یہ ہے کہ یہ کسی رئیس کا مکان تھا جو ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مکان اور اس کے ساتھ اپنے وطن کو چھوڑ کر مہاجر کی حیثیت سے پاکستان چلا گیا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں جب حضرت جوش ملیح آبادی پبلی کیشنز ڈویژن میں اڈیٹر اُردو بن کر آئے تو اسی مکان میں فروکش ہوئے۔ یہ مکان اُنھیں کسٹوڈین نے ساٹھ روپے ماہوار کرائے پر دیا تھا۔ غالباً ۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء میں جوش صاحب یہ مکان چھوڑ کر اولڈ سیکریٹریٹ کے قریب گورنمنٹ کی الاٹ کردہ کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ اور میرے والدِ محترم مرحوم صاحب کے ساتھ اپنے وعدے کے مطابق یہ مکان اُنھوں نے ہمارے حوالے کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ سال ڈیڑھ سال کا کرایہ اور بجلی کا بل ادا کیے بغیر ہی جوش صاحب چلے گئے تھے۔ لیکن ہمارے نام بھی چوں کہ یہ دس بارہ

کمروں پر مشتمل مکان ساٹھ روپے ماہانہ ہی پر الاٹ ہوُا تھا، اس لیے ہم نے اس پر اپنے کرایہ دارانہ حقوق کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لئے حکومت کے دفاتر سے کسی مطالبے کے بغیر جوش صاحب کا باقی ماندہ کرایہ اور بجلی کا بل ادا کر دیا تھا تا کہ یہ عدم ادائیگی کہیں ہم لوگوں کی بے دخلی کا باعث نہ بن جائے۔ ہم اُس وقت پانچ افراد تھے اِتنا اچھا مکان چھوڑ کر کہاں جاتے۔

مکان چوں کہ بہت بڑا تھا اِس لیے نہ صرف یہ کہ ہم لوگ اس میں بہت آرام سے رہتے تھے بلکہ جب مہمان آجاتے تھے تب بھی ہمارے آرام میں کوئی خلل نہیں پڑتا تھا اور مہمان بھی آرام سے رہتے تھے۔ فراق صاحب جب دِلّی آتے تھے ان کا مستقل ٹھکانہ یہی مکان ہوتا تھا۔ جب تک ہم لوگ اس مکان میں رہے ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ بھی ہمارے یہاں قیام کرتے رہے۔ اُن کا اِس مکان میں قیام کرنے کا سلسلہ ۱۹۵۷ء تک رہا۔ جب ہم لوگ موتی باغ نئی دہلی کے ایک مکان میں منتقل ہو گئے تو ڈاکٹر زور کا قیام مختلف جگہوں پر ہونے لگا۔ کبھی آندھرا پردیش گیسٹ ہاؤس میں اور کبھی کسی اور گیسٹ ہاؤس میں۔ اُس وقت موتی باغ کو پرانی دلّی اور نئی دلّی کے بعض علاقوں سے بہت دُور تصور کیا جاتا تھا اور باہر سے آنے والوں کو یہ خیال رہتا تھا کہ اگر ہم موتی باغ میں رہیں گے تو شہر سے بہت دُور ہو جائیں گے۔ آنے جانے کی بھی سہولیات اس وقت وہ نہیں تھیں جو آج دہلی میں میسر ہیں۔

پُل بنگش والے مکان کا ذکر یوں تو اس مضمون میں جملہ معترضہ ہی کے طور پر نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً اس مکان کا ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ ڈاکٹر زورؔ، خلیق انجم کو بہت چاہتے تھے اور ڈاکٹر زور جب تک دلّی میں مقیم رہتے تھے خلیق انجم ہر روز اُن سے ملنے آتے تھے۔ ان کے مکان سے ہمارے مکان کا فاصلہ بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔ اب جب قریب قریب ہر روز وہ زورؔ صاحب سے ملنے غریب خانے پر آتے تھے تو ظاہر ہے کہ ہم دونوں کے باہمی مراسم بلکہ دوستی بھی پختہ سے پختہ تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اکثر ان کے ساتھ اسلم پرویز بھی ہوتے تھے۔ اسلم پرویز بھی شگفتہ بیانی میں اپنی مثال آپ ہیں اور جب دونوں محفل میں موجود ہوتے تھے تو

ع - تب دیکھیے اندازِ گل افشانی گفتار

کا عالم ہوتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسلم پرویز لڑکیوں میں کہاں تک مقبول ہیں اور اس کا سبب کیا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ خلیق انجم کی صنفِ نازک میں مقبولیت کا سبب اُن کی شگفتہ بیانی ہے۔

خلیق انجم کہتے ہیں کہ وہ شاعر نہیں ہیں لیکن ہزاروں خراب شعر کہنے والا کوئی شخص اگر شاعر کہلا سکتا ہے تو ایک شعر اچھا کہنے والا شاعر ہونے سے کیسے اِنکار کر سکتا ہے بالخصوص جب اس نے دو چار ہی شعر کہے ہوں اس صورت میں اس پر خراب شعر کہنے کا الزام بھی تو نہیں آ سکتا۔

مدّت کی بات ہے خلیق انجم اپنے چند دوستوں کے ساتھ چنڈو خانے میں بیٹھے تھے۔ وہاں ایک ایسے دوست کا ذکر آ گیا جو ایک مدّت سے غائب تھا اور چنڈو خانے کے آس پاس کہیں نظر نہ آیا تھا۔ بات یہ تھی کہ اُدھار چائے پینے کا بہت روپیہ اس کے ذمے نکلتا تھا۔ چنڈو خانے کے مالک نے اس کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ شخص ایک مدّت سے نظر نہیں آ رہا ہے۔ کسی نے کہا لڑکی کے عشق میں تباہ ہو گیا ہے اور مارا مارا پھر رہا ہے۔ بے ساختہ خلیق انجم کی زبان سے نکلا

ایسا تو کم ہوا ہے، محبت میں ہار کے
عُشاق نے چکائے ہوں پیسے اُدھار کے

جامع مسجد پر مولانا سمیع اللہ کی دوکان پر کچھ ادیب اور شاعر بیٹھے تھے۔ فراق کا ذکر ہو رہا تھا کسی نے کہا کہ فراقؔ کا پورا نام رگھوپتی سہائے ہے۔ خلیق انجم نے فوراً چار مصرعے کہے:

کب وہ دِل کو جلائے تھا یارو
کب وہ آنسو بہائے تھا یارو
اس کو اُردو نے کر دیا ہے فراقؔ
ورنہ وہ تو سہائے تھا یارو

خلیق ایک دن کنور مہندر سنگھ بیدی سے کہنے لگے کہ آپ نے شعراء اور شاعرات کو ڈائس پر

ایسے دکھایا ہے کہ شاعرات آپ کے قریب ہیں اور شعراء دُور۔ اور جب آپ کسی شاعر کو داد دیتے ہیں تو کسی خاتون شاعر کی پیٹھ پر تھپکی دے کر۔ اوّل تو یہی بات داد طلب ہے اور بلکہ اس سے بھی زیادہ داد طلب فعل آپ کی تھپکی دینے کا انداز ہے۔ آپ کا ہاتھ ہوا میں کم دیر اور کمر پر زیادہ دیر رہتا ہے۔

ایک سازش کرنے والے ادیب نے دعویٰ کیا کہ میں پٹھان ہوں۔ خلیق انجم نے کہا کہ یہ بات غلط ہے۔ تم پٹھان نہیں ہو سکتے۔ اُس نے کہا ہمارا محلّہ ہی پٹھانوں کا ہے اس میں سب پٹھان رہتے ہیں۔ خلیق انجم نے جواب میں کہا تمہارے محلے میں کوئی غیر پٹھان بھی رہتا ہوگا۔

ایک دفعہ خلیق انجم نے غلطی سے ایک شاعرہ کے مکان پر دستک دی۔ اندر سے شاعرہ کی گرج دار آواز آئی۔ کون ہے اس وقت دستک دینے والا۔ اُنھوں نے فوراً اپنے حواس جمع کرتے ہوئے کہا لالا جی نے بھیجا ہے۔ شاعرہ نے اسی غصے بھری آواز میں کہا کون لالا جی۔ اُنھوں نے بہت اطمینان سے جواب دیا۔ ہار کی قیمت لانے کے لیے، آپ کے شوہر نے ہار کی قیمت ابھی تک نہیں بھجوائی۔ دو ماہ قبل جُھمکوں کی قیمت تو بھجوا دی تھی لیکن ہار کے دام ابھی تک نہیں بھجوائے۔ اب شاعرہ حیران کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ گھر میں نہ تو جھمکے آئے ہیں اور نہ ہار۔ خلیق انجم تو لالا جی کا پیغام دے کر وہاں سے چل دیئے لیکن جب شوہر صاحب گھر واپس آئے ہوں گے تو.......

خلیق انجم کے ایک دوست شیر کے شکار کے بہت شوقین تھے لیکن شیر ہاتھ نہیں آتا تھا۔ یہ دُوسرے جانور مار لاتے تھے لیکن شیر کا شکار اُن کے مقدر میں نہیں تھا۔ ایک دفعہ ان کے مقدر نے یاوری کی اور مدھیہ پردیش میں ایک شیر کا شکار کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اُنھوں نے خوشی میں گھر تار دیا LION KILLED۔ اِتفاق کی بات ہے کہ جب تار والا تار لے کر ان کے گھر پہنچا تو خلیق انجم دروازے پر موجود تھے۔ اُنھوں نے تار والے سے تار لے کر پڑھا اور اسے جیب میں رکھ لیا۔ دُوسرے دن ایک شخص کو اُن دوست کے گھر بھیجا کہ مدھیہ پردیش میں آپ کے صاحب خانہ نے دو ہزار روپے میں ہم سے پنجرے میں بند شیر خریدا تھا۔ ایک ہزار روپیہ دے دیا تھا اور

ایک ہزار روپیہ باقی ہے وہ ادا کیجیے۔ وہ شخص تو یہ جواب سن کر کہ ابھی صاحب خانہ واپس نہیں آئے لوٹ گیا۔ لیکن دو چار روز بعد جب صاحب خانہ شیر کی لاش لیے ہوئے اس توقع پر گھر پہنچے کہ مبارک باد ملے گی تو گھر والوں نے اُن کا خوب مذاق اُڑایا کہ پنجرے میں بند شیر کو گولی مار دی، جا کر فلاں شخص کو باقی ایک ہزار ادا کرو۔ وہ سٹ پٹا کر رہ گئے۔ لگے اس شخص کو گالیاں دینے جس نے اُن پر یہ بہتان لگایا تھا اور گالیوں کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ خلیق انجم بھی ہمدردی کے طور پر اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے اور جس شخص نے بہتان لگایا تھا اُسے برا بھلا کہتے رہے۔

ایک دوست کے گھر میں محفل جمی تھی۔ تصدق حسین خالد کا ذکر آیا کسی نے کہا کہ فلاں سنہ میں ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ مالک رام صاحب بھی محفل میں موجود تھے۔ اُنھوں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا کہ اس سنہ سے پہلے میں نے وفیات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ میری تحریر کی وفیات میں تو ان کا ذکر نہیں ہے۔ خلیق نے چھوٹتے ہی کہا وہ آپ کی زد سے نکل گئے تھے۔ وہ وفیات کے شروع ہونے سے ایک سال قبل ہی دُنیا سے فرار ہوگئے۔

خلیق انجم ایک انٹرویو میں پیش ہوئے۔ شیخ چاند کا ذکر آ گیا، ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم ایکسپرٹ کی حیثیت سے بورڈ آف انٹرویو کے رُکن تھے۔ اُنھوں نے شیخ چاند کے ذکر پر کہا کہ شیخ چاند تو بہت معمولی مصنف تھے۔ اس پر خلیق نے جواب دیا، جی ہاں، لیکن اُنھوں نے جو شاگرد پیدا کیے ہیں وہ بڑے مصنف تھے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

کروڑی مل کالج میں ہندی کے ایک لیکچرر تھے وشوناتھ ترپاٹھی۔ بہت اچھی اُردو جانتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی ہندی کی کلاس میں طلبہ کو اُردو پڑھانے کا انتظام اس خیال سے کر رکھا تھا کہ اچھی ہندی جاننے کے لیے اُردو کا جاننا ضروری ہے۔ ایک دن خلیق انجم مصروف تھے۔ اُنھوں نے ترپاٹھی جی سے کہا کہ آج میری اُردو کلاس آپ لے لیں۔ ترپاٹھی جی بولے لیکن میں تو اُردو نہیں جانتا، اس لیے یہ جرم ہے کہ میں اُردو پڑھاؤں۔ خلیق نے فوراً کہا کہ لیکن آپ ہندی بھی تو پڑھاتے ہیں۔

پاکستان کے ایک سفر میں خلیق انجم اور میں اکٹھے تھے۔ دراصل ہم دونوں اُردو مصنفین کے ایک ڈیلی گیشن کے رُکن تھے جو پاکستان اکیڈمی آف لنگویجز کی دعوت پر پاکستان گیا تھا۔ ہلٹن ہوٹل میں ہمارا قیام تھا۔ ڈاکٹر وحید عشرت مجھ سے ملنے آئے۔ خلیق انجم نیچے لابی میں تھے۔ ان سے اُنھوں نے پوچھا کہ آزاد کس کمرے میں ہیں۔ خلیق نے کمرے کا نمبر بتایا تو وہ میرے یہاں تشریف لائے۔ وہ میرے لیے میرے ان مضامین کا آنریریم بھی لائے تھے جو ''اقبال ریویو'' اور ''اقبالیات'' میں شائع ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد ہمارے ڈیلی گیشن کو پروگرام کے مطابق ایک جگہ جانا تھا۔ میں، خلیق انجم اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ہم تینوں ایک ہی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ خلیق نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر وحید عشرت آپ کے کمرے کا نمبر پوچھ رہے تھے، میں نے بتا دیا تھا۔ میں نے کہا یار تم نے بہت اچھی بات کی وہ میرے لئے میرے مضامین کی رائلٹی لائے تھے۔ اب یہاں شاپنگ میرے لیے آسان ہوگئی ہے۔

رفیعہ آپا کہنے لگیں میری کتاب کا بھی ایک پبلشر یہاں ہے۔ اُس سے ملاقات ہوجاتی تو رائلٹی مل جاتی۔ خلیق انجم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا کہ رفیعہ آپا آپ اپنے پبلشر کی بات مت کیجئے۔ وہ یہاں آیا تھا بہت غصے میں تھا اور آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ رفیعہ آپا نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا کیا مطلب؟ غصے میں، اور مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ خلیق نے کہا کہ جی ہاں وہ کہہ رہا تھا کہ میں نے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی کتاب چھاپی اور نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب چھپنے کے چند دن بعد طلبہ نے مجھے گھیر لیا اور بھرے بازار میں میری پٹائی کردی۔ رفیعہ آپا نے خلیق انجم کی بات کا یقین کرتے ہوئے کہا۔ میں نے تھوڑا ہی اسے کتاب چھاپنے کے لیے کہا تھا اُس نے خود ہی چھاپی تھی۔

خلیق انجم کی بذلہ سنجی اور شگفتہ بیانی کا ذکر چل نکلا تو کچھ اور دل چسپ واقعات سُن لیجے۔

کچھ سال ہوئے ایک ادیب کو ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ ملا جس پر بعض لوگوں کو اختلاف تھا۔ خود خلیق انجم بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ادیب انعام کا مستحق نہیں ہے یہ انعام اسے دے کر ساہتیہ اکادمی کے وقار میں کمی آئی ہے۔ اب لطیفہ سنیے۔

خلیق انجم کی ایک ایسے ادیب سے بحث ہوگئی جس نے ان کی ایک کتاب پر بے جا تنقید کی تھی۔ اور اس بحث میں نوبت چیخ پکار کو پہنچ گئی۔ خلیق انجم نے بہت اونچی آواز میں غصے ہو کر کہا کہ آپ نے میرے خلاف جو کچھ لکھا ہے میں اگر چاہتا اس کا بدلہ ایسا چکاتا کہ آپ تو کیا آپ کا پورا خاندان کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ آنے والی نسلیں آپ کے نام سے شرماتیں۔ اُن صاحب نے انتہائی غصے میں کہا کہ آپ میرا کیا کر لیتے۔ خلیق انجم نے اسی غصے کے لہجے میں جواب دیا کہ میں آپ کو ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ دلوا دیتا۔ اس فقرے پر بڑے زور کا قہقہہ لگا اور محفل زعفران زار ہوگئی۔

حال ہی میں انجمن ترقی اُردو (ہند) کے زیرِ اہتمام قاضی عبدالغفار پر سیمینار منعقد ہوا۔ خلیق صاحب نے مقالے پڑھنے کے لیے جن لوگوں کو دعوت دی تھی اُن میں دلّی کی ایک خاتون بھی تھیں۔ اُن خاتون کو قاضی صاحب کی ''لیلیٰ کے خطوط'' اور ''مجنوں کی ڈائری'' کے موضوع پر مقالہ لکھنا تھا۔ ایک دن ہم لوگ ''اُردو گھر'' میں خلیق صاحب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ خاتون آگئیں اور اُنھوں نے بیٹھتے ہی کہا کہ آپ نے مجھے ''لیلیٰ کے خطوط'' اور ''مجنوں کی ڈائری'' پر مقالہ لکھنے کے لیے کہا ہے۔ یہ دونوں کتابیں کسی لائبریری میں نہیں ملتیں۔ آپ نے مجھے لیلیٰ مجنوں کے چکر میں کیوں ڈال دیا۔ خلیق انجم نے برجستہ جواب دیا کہ ''دل کی بات کہنے کا اور کیا طریقہ ہوسکتا تھا۔''

تین چار سال کی بات ہے کہ ایک ایمبیسی میں بوفے ڈنر تھا۔ لوگ ہاتھوں میں پلیٹیں لیے چار چار پانچ پانچ کے گروہ بنائے کھانا کھا رہے تھے۔ خلیق انجم ایک گروہ میں کھڑے حسب عادت اپنی شگفتہ بیانی سے لوگوں کو ہنسا رہے تھے۔ اچانک ایک اجنبی صاحب ہاتھ میں پلیٹ لیے اس گروہ میں شریک ہوگئے۔ ایک دو منٹ تو خاموش رہے اور پھر جو اُنھوں نے بولنا شروع کیا ہے تو خاموش ہونے کا نام نہیں لیا۔ ایک دفعہ سانس لینے کے لیے رُکے تو خلیق انجم نے اُن صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا معاف کیجئے گا میں آپ سے واقف نہیں ہوں لیکن ایسا لگتا

ہے کہ آپ ممبر آف پارلیمنٹ ہیں۔ ان صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ کا خیال صحیح ہے لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ خلیق انجم نے جواب دیا کہ آپ اتنی دیر سے ایسی باتیں کر رہے ہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں، پھر آپ اپنی کہے جا رہے ہیں اور کسی کی نہیں سُن رہے ہیں۔ اس پر بڑے زور کا قہقہہ لگا اور وہ صاحب شرمندہ ہو کر چلے گئے۔

ڈیڑھ دو سال پہلے ڈاکٹر خلیق انجم کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور جس کی وجہ سے پاؤں کی ہڈی میں فریکچر ہو گیا۔ جب پلاسٹر بندھ گیا تو ڈاکٹر نے ہدایت دی کہ آپ پاؤ زمیں پر نہ رکھیں۔ پلاسٹر بندھنے کی وجہ سے خلیق کو بہت تکلیف ہو رہی تھی اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر میں کراہ رہے تھے لیکن حسِ مزاح اَب بھی برقرار تھی۔ کہنے لگے ڈاکٹر صاحب دُشمنوں اور دوستوں کو ہمیشہ مجھ سے یہی شکایت رہی ہے کہ میں پاؤ زمین پر نہیں رکھتا۔ اِتنی تکلیف میں بھی دُوسروں کو ہنسانے کے لیے بہت بڑا دِل گردہ چاہیے۔

بس ایک واقعہ اور سن لیجیے۔ ایک ادبی جلسے میں ایک ادیب نے کسی موضوع پر تقریر کرتے ہوئے بے وجہ انجمن ترقی اُردو (ہند) پر اِلزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ صاحب تقریر کر کے بیٹھے تو خلیق انجم جواب دینے کے لیے کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے حضرات آپ کے علم میں ہوگا کہ جامع مسجد سے حوض قاضی تک سواری کی رکشائیں چلتی رہیں۔ کسی زمانے میں رکشا والے چار آنے فی سواری لیتے تھے۔ ایک دن میرے ایک دوست کو جلدی تھی وہ رکشا میں بیٹھ گئے اور دُوسری سواری کا انتظار کیے بغیر اُنھوں نے رکشا والے سے چلنے کے لیے کہا۔ جب رکشا حوض قاضی پہنچی اور وہ میرے دوست رکشا سے اُترے تو رکشا والے نے سواری کو اُوپر سے نیچے تک دیکھا۔ کالی شیروانی، سفید براق چوڑی دار پائجامہ، پالش کیے ہوئے چمکتے ہوئے جوتے، چوں کہ وہ رکشا میں اکیلے آئے تھے اس لیے اُنھیں دو سواریوں کے آٹھ آنے دینے تھے۔ رکشا والے نے اُن صاحب کو دیکھ کر دو روپے مانگے۔ اُنھوں نے آٹھ آنے دینا چاہا رکشا والا نہیں مانا۔ دونوں میں تکرار ہو گئی۔ میرے دوست کو غصہ آ گیا۔ اُنھوں نے

شیروانی اُتار کر رکشا پر ڈالی اور غصے میں کہا کہ ''ابے اگر ہم نے شیروانی پہن لی ہے تو تُو سمجھتا ہے کہ ہم شریف آدمی ہیں۔'' رکشا والا ڈر گیا اور آٹھ آنے لے کر خاموشی سے چلا گیا۔ یہ واقعہ سنا کر خلیق انجم نے کہا کہ حضرات میں اب اپنی شیروانی رکشا پر ڈالتا ہوں اور عرض کرتا ہوں۔ ہال قہقہوں سے گونج اُٹھا لیکن خلیق انجم تو غصّے میں تھے۔ اُنھوں نے پندرہ بیس منٹ تک اپنے شعلہ نوائی کے جوہر دکھائے۔

مَیں نے اِس مضمون کے شروع میں خلیق انجم کی چند کتابوں کا ذکر کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان کی چند اور کتابوں کے متعلق بھی لکھوں گا۔ لیکن ان کی خوش بیانی اور خوش مزاجی کی باتیں شروع ہو گئیں۔ خلیق انجم کے اِس طرح کے لطیف جملوں اور خوش بیانی پر مشتمل پوری ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے اور اقبال کے الفاظ میں ان کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

'کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ'

مجموعۂ محاسن ــــ سیّد حامد

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آرہا ہے کہ سیّد حامد صاحب سے پہلے پہل میری ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ ہاں اِتنا یاد ہے کہ تقسیمِ ہند کے بعد جب ہم لوگ راولپنڈی اور لاہور کو چھوڑ کر دلی آکے آباد ہوئے تو میرٹھ یا اس کے قریب کے ایک ضلعے (شاید بلند شہر) کی بزمِ اَدب سے مشاعرے کا دعوت نامہ آیا۔ سیّد حامد اس ضلعے کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ وہ اس مشاعرے میں شریک ہوئے اور اس میں اپنی غزل اُنھوں نے پڑھی۔ غزل تمام سننے والوں کو پسند آئی اور اس پر داد بھی بہت ملی۔ ان کی غزل میں مجھے وہ تمام محاسن نظر آئے جو ہماری کلاسیکی غزل کا سرمایہ امتیاز ہیں۔ اس مشاعرے سے جن شعراء کے کلام کا میں خاص طور سے تاثر لے کو آیا اس میں سیّد حامد صاحب کی غزل شامل تھی لیکن اِسے ملاقات تو نہیں کہہ سکتے۔

اب میں کل پرسوں سے یہی سوچ رہا تھا کہ جسے ملاقات کہہ سکیں وہ کہاں ہوئی۔ ان کے ساتھ ملاقات کو میں اہمیت اس لیے دیتا ہوں کہ ایک وقت میں ان سے خاصا قریب ہوگیا اور اُس قُربت کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس قُربت کے اِبتدائی دنوں کے بعد کا ذکر یوں ہے کہ ڈاکٹر

سیّد محمود مرحوم ہمارے منسٹر آف اسٹیٹ فار ایکسٹرنل افیرز تھے اور میرے عزیز دوست حسن نعیم (جن کا انتقال ہو چکا ہے لیکن جن کی شاعری اِنشا اللہ ہمیشہ زندہ رہے گی) ڈاکٹر سیّد محمود کے پرائیویٹ سیکریٹری تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی معیادِ وزارت جب ختم ہوگئی تو حسن نعیم کی ملازمت بھی ختم ہوگئی۔ حسن نعیم نے خود مجھ سے کہا کہ میری سفارش تم نے فلاں فلاں افسر سے کی ہے سیّد حامد صاحب سے آپ کی واقفیت ہو تو اُن سے بھی کہہ کے دیکھ لیتے ہیں۔ میں نے کہا اُن سے اچھی واقفیت ہے، میرے کرم فرما ہیں اُن کے دولت کدے پر ہم جا سکتے ہیں چنانچہ اُن کو لے کر میں حامد صاحب کے دولت کدے پر پہنچا۔ وہاں حسن نعیم کا تعارف کرایا۔ حامد صاحب اُن کے نام اور کلام سے پہلے ہی آشنا تھے۔ اُنھوں نے ساری بات سُن کر وعدہ کیا کہ وہ پوری کوشش کریں گے اور چند روز کے بعد حسن نعیم کو نئی ملازمت مل گئی۔ (اس ملاقات میں حسن نعیم نے اُن سے کلام ارشاد کرنے کی فرمائش کی۔ سیّد حامد صاحب نے غزل سنائی۔ غزل بہت مرصع اور دلکش تھی۔ اور ہم لوگ ہر طرح سے خوش وخُرم واپس آئے)

حسن نعیم کی بات یاد آنے سے قبل میں اِس سوچ بچار میں غرق تھا کہ پہلی ملاقات کہاں ہوئی اور ساتھ ہی سیّد حامد صاحب کا مجموعۂ کلام ''شیرازہ'' بھی زیرِ نظر تھا تو ایک نظم 'یادِ رفیق'' میں' جو سیّد محمد ذوالنورین کے انتقال پر سیّد حامد صاحب نے کہی' مجھے اپنا ذکر نظر آیا تو خیال آیا کہ غالباً ایک یا ایک سے زیادہ ملاقاتیں سیّد محمد ذوالنورین مرحوم کے دولت کدے پر ہوئیں۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ سیّد حامد انجمن ترقی اُردو (ہند) کے صدر منتخب ہوئے۔ اُس مدّتِ صدارت میں اُن کے ساتھ صرف ملاقاتیں ہی نہیں رہیں بلکہ اُن کی تقریریں اور خطبات سننے کا بھی کئی بار اتفاق ہوا اور میں نے اکثر یہ دیکھا کہ جب بھی اعلائے کلمۃ الحق کا وقت آیا ان کا قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی یاد میں ایک جلسہ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا۔ سیّد حامد صاحب نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے محاسن بیان کرنے کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جب انجمن ترقی اُردو (ہند) کی طرف سے ایک لاکھ دستخطوں پر درخواست اُس وقت

کے صدرِ مملکت کے سامنے پیش کی گئی تو ڈاکٹر حسین صاحب نائب صدر تھے۔ پھر ڈاکر صاحب جب جمہوریہ ہند کے صدر منتخب ہوئے تو وہ درخواست اُن کے سامنے آئی اور ڈاکٹر صاحب نے اُردو کے لیے کچھ نہیں کیا۔ مُجھے یہ کہتے ہوئے دلی مسرّت ہورہی ہے کہ سیّد حامد صاحب کے عہدِ صدارت میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نے ترقی کی خاصی منزلیں طے کیں۔

اِس کے بعد سیّد حامد صاحب سے ملاقاتیں اُس مدّت میں خاصی رہیں جب سیّد حامد صاحب اور یہ خاکسار مولانا آزاد نیشنل اُردو یونی ورسٹی کی پہلی ایگزیکٹو کونسل کے رُکن منتخب ہوئے۔ اس کونسل کی معیاد تین برس تھی اور کونسل کی میٹنگ میں سیّد حامد کا کنٹری بیوشن دُوسرے تمام ارکان سے زیادہ رہا۔ میں بلا مبالغہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایجوکیشن کے ساتھ ان کا گہرا تعلق مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔

جہاں تک سیّد حامد صاحب کے علمی اور ادبی مقالات کا یا اُن کی تقاریر اور خطبات کا تعلق ہے ان کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے ان کی غزل گوئی کا ذکر تو اکثر سامنے آتا رہتا ہے لیکن مقامِ حیرت ہے کہ ان کی نظم گوئی کی طرف ہمارے نقاد حضرات یا محققین حضرات کی نظر نہیں گئی۔ راقم التحریر خود ایک قاری کی حیثیت سے ان کے کمالِ نظم گوئی سے بے خبر تھا۔ اور اب جو ان کے مجموعہ کلام ''شیرازہ'' کی ایک جلد مُجھے ملی اور میں نے اسے کہیں کہیں سے نہیں بلکہ جس ترتیب سے یہ مرتب ہوئی ہے اُسی ترتیب سے پڑھنا شروع کیا تو صرف اپنی بے خبری اور لاعلمی پر افسوس نہیں ہُوا بلکہ اوروں کی بے خبری پر بھی حیرت ہوئی کہ ایسا کیوں ہے۔ اس کا ایک سبب تو وہی ہوسکتا ہے جو سیّد حامد صاحب کے اِس مجموعہ کلام کے پیش لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھوں نے خود اس شاعری کو جرائد کے ذریعے سے یا مجموعوں کی صورت میں شائع کرا کے منظرِ عام پر لانے کی زحمت نہیں کی۔ اپنے مجموعہ کلام کو شائع کرانا اور تبصرے کے لیے مطبوعہ کتاب مختلف جرائد کو بھیجنا Self publicity یا Self advertisement کی ذیل میں نہیں آتا۔ جب ہم شعر کہتے ہیں تو دُوسروں تک سلیقے سے پہنچانے میں کوئی حرج نہیں۔ Self publicity

تو یہ ہے کہ شاعر ''ہمچو ما دیگرے نیست'' کا نعرہ لگاتا پھرے اور بلائے بے درماں بن کر ہر کہ و مہ پر گرتا پھرے یا جنھیں وہ نقاد سمجھتا ہو اُنھیں شراب و کباب کی دعوتیں دیتا پھرے۔ یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آج کل ایسا ہو رہا ہے اور ایسے طور طریقے اُردو زبان و ادب کے لیے زہرِ قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں —— لیکن اپنی ادبی تخلیقات سے قطعاً غافل ہو جانا بھی دُوسری انتہا ہے۔

میری دلی خواہش ہے کہ میں اس مضمون میں سیّد حامد صاحب کی نظم گوئی کا ذکر کروں لیکن خلیق انجم نے یہ بھی ساتھ ہی کہا ہے کہ یہ مضمون آج ہی چاہیے بلکہ ابھی چاہیے اور آپ واپس جانے سے پہلے موعودہ تحریر دے کر جائیں۔

تو کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ ''شیرازہ'' کی نظمیں پڑھتے پڑھتے جب میں ''داستانِ دلبر و دلدار'' پر پہنچا اور اسے اوّل سے آخر تک پڑھا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اُردو مثنوی ایک بار پھر بلند معیار پر پہنچ گئی ہے۔ روانی، منظر نگاری اور جذبات نگاری میں اس مثنوی کا جواب نہیں۔ یہ مثنوی جب میں آخر تک پڑھ چکا تو ایک بار پھر میں نے ''پیش گفتار'' پر نظر ڈالی۔ اس میں سیّد حامد لکھتے ہیں:

> ''......اس کا سین دیارِ غیر ہے اور اس کے کردار اہلِ فرنگ ہیں۔ ہماری مثنویوں کا محل قدرتی طور پر مشرقی ممالک رہے ہیں۔ میرے لیے یہ داستان اس لیے کشش کا باعث بن گئی کہ ہیرو اور ہیروئن دونوں نے شاعری میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ فکر و فن کے اشتراک نے باہمی کشش کی شکل اختیار کر لی جسے محبت بنتے دیر نہیں لگتی۔ ان کی محبت ایک پاکیزہ اور شائستہ محبت تھی۔ نادیدہ اور نارسیدہ۔ اس خیال نے رابرٹ براؤننگ کے دامنِ دل کو اور بھی اپنی طرف کھینچا کہ ایک نوخیز خاتون ایک

گوشہ نشین اور عزلت گزیں خاتون شاعری سے اپنا غم غلط کر رہی
ہے اور تنہائی کے احساس کو اس طرح سنا رہی ہے۔ اس پر مستزاد
یہ امر کہ وہ علیل ہے اور صاحبِ فراش اور ایک جابر باپ کے
بنائے ہوئے زنداں میں اسیر ہے۔ حیرت اور ہمدردی نے قدر
اور عزت کے ساتھ مل کر محبت کی شکل اختیار کر لی۔"

اِس مثنوی کے حسنِ بیان، اس کی عذوبت، روانی اور دلکشی نے مجھے پوری طرح اسیر کر لیا اور جب تک مثنوی کو آخر تک پڑھ نہ لیا کتاب کو ہاتھ سے نہ دیا۔ محبت اور پاکیزہ محبت کا بیان اس قدر شعریت اور کمالِ فن کے انداز میں اس مثنوی کو میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" تک لے جاتا ہے بلکہ کئی مقامات پر اس سے مختلف اور اس سے بلند تر بھی۔ دراصل اس مثنوی کو پڑھتے ہوئے مجھے اکثر یہ خیال آیا کہ رابرٹ براؤننگ کو میں محض ایک اشارہ کیوں نہ سمجھوں اور اپنے اس خیال کو کیوں نہ اہمیت دُوں کہ الزبتھ کے حُسن و جمال کو اشعار میں بیان کرتے ہوئے سیّد حامد اس اَن دیکھے محبوب کے عشق میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ اور جو کچھ الزبتھ کے بارے میں رابرٹ براؤننگ نے سوچا ہے اور کہا ہے وہ دراصل شاعر کی اپنی سوچ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو شاعر کی نوکِ قلم پر یہ اشعار کیسے آ سکتے تھے۔

انوکھا نرالا یہ پروانہ تھا — جو محفل میں شمعوں سے بیگانہ تھا

نظر میں کوئی شمع آئی نہیں — کوئی مہ جبیں دل کو بھائی نہیں

طلب تھی اُسے فکر کے نور کی — ضرورت نہ پہلو میں تھی حور کی

اسے حسنِ کردار درکار تھا — تصنع سے از بسکہ بیزار تھا

یا

جو ٹکرائی تخئیل جذبات سے — نمودِ سحر ہو گئی رات سے

زباں اُس نے دی فکر و جذبات کو — کیا شعر میں قید لمحات کو

یا صفحہ نمبر ۲۱ کا کوئی شعر پڑھ لیجیے۔ میں جب اس صفحے کے آخری شعر پر پہنچا تو بے اختیار میرے قلم نے صفحے کے شروع میں یہ لکھ دیا۔ "کس شعر کی تعریف کی جائے۔ تمام اشعار ماورائے تعریف ہیں!" اگر ڈاکٹر خلیق انجم کا ڈر نہ ہوتا جن کی فرمائش ہے کہ مضمون مختصر ہو اور تھوڑی دیر ہی میں چاہیے تو میں یہاں بائیس کے بائیس اشعار اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر نقل کر دیتا۔ بہر طور اَب یہاں "جرأتِ اظہار" کے زیرِ عنوان دو اشعار دیکھیے۔

مری بے محابا جسارت معاف — کلیسا سے کیجئے نہ اب انحراف

صدا دے رہی ہے کلیسا کی راہ
چلیں کیوں نہ کر لیں خدا کو گواہ

اور پھر اُن اشعار پر ایک نظر ڈالیے جن میں شاعر با کمال اظہارِ محبت کی مختلف منازل طے کرتا ہوا مثنوی کو اس مقام پر لاتا ہے۔

کیا پیار ہاتھوں کو، چُومی جبیں — جو دیکھا نہ برہم ہوئی نازنیں

لبوں سے ہوئے جا کے پیوست لب — نہ حائل حیا تھی نہ حائل اَدب

رہا کوئی حائل نہ اب درمیاں
کہاں جا کے ٹھہرا ہے یہ کارواں

یا

لبوں کی وہ رنگت کہ شرمائے لعل — کہاں سے کوئی لائے ان کی مثال

عقیقِ یمن تھے کہ لعلِ ختن — حسینوں کی سرتاج بھی گلبدن

وہ نازک بھی تھے اور لبریز بھی　　وہ دعوت بھی تھے اور مہمیز بھی

وہ شوخی وہ نخوت وہ اُلفت وہ ناز　　لبوں میں تھی صہبائے مینا گداز

ایسے نازک مقامات کو شعر میں مقید کرنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ تلوار کی دھار پر چلنے کا معاملہ ہے۔ توازن کا ذرا سا عدمِ توازن کی طرف جُھکنا شعر کے حُسن کو، اِس کی پاکیزگی کو مجروح کرسکتا ہے۔ ادبی توازن اور ادبی وقار کو عدم توازن اور غیر ادبی مقام پر لاسکتا ہے۔ شائستگی کو عدمِ شائستگی میں تبدیل کرسکتا ہے۔ یہ پُل صراط سے گزرنے کی بات ہے۔ شاعری میں نازک مضامین کو چھونا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ فراق صاحب نے جب اِن موضوعات کو چُھوا تو اُن کے رہوارِ خیالِ یار رہوار قلم نے ترغیبِ جنسی کا رُخ کیا۔ سیّد حامد کے یہاں آکر عشقیہ شاعری نے پاکیزگی اور شائستگی کا ماحول پیدا کیا۔ میں اس دل ونگاہ کی پاکیزگی کے لیے سیّد حامد صاحب کو بلکہ اُردو دُنیا کو دِلی مبارک باد دیتا ہوں۔ اور اس بات پر ''شیرازہ'' کے مصنف سے گِلہ بھی کرتا ہوں کہ اُنھوں نے اپنی منظومات کے مجموعے کو اُردو دُنیا سے چالیس پچاس سال تک پوشیدہ رکھ کے ہم اُردو والوں کے ساتھ وہ حق دوستی ادا نہیں کیا جس کے ہم مستحق تھے۔

(۱۸/اگست ۲۰۰۲ء)

☆

مندرجہ بالا مضمون تو میں نے بہت جلدی میں لکھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھنے کے لیے بہت کم وقت دیا۔ وہ بھی مجبور تھے۔ جس کتاب کے لیے مضمون درکار تھا وہ قریب قریب زیرِ طباعت تھی۔ اسی لیے کتاب چھپنے کے بعد اس مضمون کا جب سیّد حامد صاحب نے مجھ سے ذکر کیا تو مجموعۂ کلام کا نام ''شیرازہ'' میرے حافظے سے نکل چکا

تھا۔ معلوم نہیں اُنھوں نے کیا محسوس کیا ہوگا۔ بہر طور یہ مضمون لکھنے کے بعد جب سیّد حامد صاحب کی دو نثری کتابیں ''مضامینِ سیّد حامد'' مجھے موصول ہوئیں تو میں ان کی ادیبانہ نثر دیکھ کے حیران رہ گیا۔ یہ کتاب ان کے سیاسی مقالات پر مشتمل ہے اور بڑے بڑے گنجلک مسائل کو اُنھوں نے اس طرح سُلجھایا ہے کہ پتھر پانی ہوگیا ہے۔ اس کتاب میں اُنھوں نے زیادہ تر مشورے ہندوستان کے مسلمانوں کو دیے ہیں جن سے مسلمانوں کے علاوہ سارے ہندوستان کا مفاد وابستہ ہے۔ لیکن ہمارے ملک کی بدقسمتی یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں اپنے اپنے مذاہب کے بتائے ہوئے طور طریقوں سے دُور چلے گئے ہیں۔ اور دونوں اپنے اپنے مذاہب کی غلط تفسیروں میں اُلجھ گئے ہیں۔ ہندوؤں کے دہشت پسند طبقے کی بات یہ ہے کہ اُنھوں نے صورتِ حال بابری مسجد کے انہدام تک پہنچادی اور مسلمانوں کے ناسمجھ طبقے نے بعض ایسے مفسرین کلامِ پاک کی تاویلات کو پیش نظر رکھا اور اُن پر عمل کرنے کی تلقین کی جنھوں نے آیاتِ قرآنِ شریف اور احادیثِ نبوی کو پُوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنی دونوں مذکورہ کتابوں میں سیّد حامد اس طرح کے بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو صحیح اسلام کی طرف واپس لانا چاہتے ہیں۔ یہی وہ کام ہے جو علامہ اقبال مرحوم نے مسلمانوں کے لیے کیا لیکن اکثر مسلمانوں نے ان کی ساری شاعری قوالوں کے سپرد کردی۔ کیا ایسے مسلمانوں نے علامہ کی کتاب The Reconstruction of Religious thought in Islam دیکھی ہے؟ نہیں دیکھی تو وہ صرف مذکورہ کتاب کا دیباچہ ہی پڑھ لیں۔ اگر علامہ اقبال کو یقین نہ ہوتا کہ اکثر مسلمان اسلام کی صحیح تاویل کو چھوڑ کر غلط تاویل کے اسیر ہوگئے ہیں تو وہ ایسا کیوں کہتے ـ

تمدن، تصوف، شریعت، کلام　　بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھوگئی　　یہ اُمّت روایات میں کھوگئی

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب　　مگر لذتِ شوق سے بے نصیب

بیان اُس کا منطق سے سُلجھا ہوا　　لغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد　　محبت میں یکتا، حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا　　یہ سالک مقامات میں کھو گیا

یا فارسی میں ایسا کیوں کہتے ـ

زمن بر صُوفی و مُلّا سلامے　　کہ پیغامِ خدا گفتند ما را

و لے تاویلِ شاں درحیرت انداخت　　خدا و جبرئیل و مصطفیٰؐ را

(۱۴ر جون ۲۰۰۳ء)

سردار جعفری

(جموں یونیورسٹی میں)

شعبہء اُردو، جموں یونیورسٹی جموں کے لیے وہ تین ماہ کی مدّت یقیناً ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہے جس میں شعبے کی دعوت پر مُلک کے نامور ادیب اور شاعر علی سردار جعفری وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے یونیورسٹی میں رہے اور اُنھوں نے اپنے اَفکار سے صرف شعبہء اُردو ہی کو نہیں بلکہ ساری یونیورسٹی اور سارے جموں کے علمی اور اَدبی حلقوں کو مستفید فرمایا۔

علی سردار جعفری یکم اکتوبر ۱۹۸۳ء کو جموں تشریف لائے اور ۳۱ر دسمبر تک یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر مقیم رہے۔

اس تین ماہ کی مدّت میں جعفری صاحب نے طلبہ کے لیے لیکچر بھی دیئے اور تحقیق کا کام کرنے والے ایم فل، پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے اسکالروں کو مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ لیکن

ان کے جس کام کی وجہ سے تمام یونیورسٹی اور اہلِ جموں رطب اللسان ہیں اُن کے وہ لیکچر ہیں جنھیں ہم پبلک لیکچر کہہ سکتے ہیں۔ یعنی وہ لیکچر جن میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ شہر اور ریاست کے اہلِ علم اور دانشور بھی شریک ہوئے۔

اس سلسلے میں سردار جعفری کا پہلا لیکچر جو یونیورسٹی کے پرانے کیمپس میں ہوا۔ ''اُردو کی عالمی حیثیت'' کے موضوع پر تھا۔ دُوسرا لیکچر نئے کیمپس میں ہوا جس کا عنوان تھا۔ ''فلم آرٹ'' یہ موضوع ہم یونیورسٹی والوں کے لیے بڑی حد تک ایک نیا موضوع تھا اور اس پر ایک گھنٹے کے لیکچر میں جعفری صاحب نے فلم اور فلم سازی کی باریکیوں پر نہایت تفصیل سے بات کی۔ آپ نے سنل سے مشکل پہلو کو بڑی خوبصورتی اور نفاست سے بیان کیا اور معاشرے میں فلم کی اہمیت پر بھرپور روشنی ڈالی۔

یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایم آر پوری نے 'جنھوں نے اس لیکچر کی صدارت کی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ لیکچر سننے کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ یونیورسٹی میں ہمیں ایک فلم سوسائٹی کی بنیاد رکھنا چاہیے۔ چنانچہ اُنھوں نے جعفری صاحب سے فرمائش کی کہ وہ اس مجوزہ فلم سوسائٹی کے بارے میں ایک جامع نوٹ بنا کے اُنھیں دیں۔ جعفری صاحب نے یہ نوٹ تیار کر کے وائس چانسلر صاحب کو دیا لیکن وائس چانسلر صاحب کے ریٹائر ہو جانے کی بنا پر اس نوٹ پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔

پروفیسر جعفری کا تیسرا لیکچر یونیورسٹی کے شعبہء انگریزی کے زیرِ اہتمام ہوا اور لیکچر کا عنوان تھا۔ ''اُردو کی ترقی پسند شاعری'' یہ لیکچر انگریزی میں تھا۔ جس میں فاضل مقرر نے ادب کی ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ لیکچر کے دوران میں علی سردار جعفری نے انگریزی شاعری سے متعدد مثالیں پیش کرتے ہوئے اُردو اور انگریزی شاعری کی مماثلت اور عدم مماثلت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس دوران قیام میں سردار جعفری کو مختلف علمی اور ادبی انجمنوں کی جانب سے متعدد

استقبالیے دیئے گئے جن میں ڈوگری سنستھا کی طرف سے کلچرل اکیڈمی میں دیا ہوا استقبالیہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جموں یونیورسٹی کی صدر شعبہء ڈوگری ڈاکٹر چمپا شرما نے اپنی تقریر میں سردار جعفری کے علمی کاموں کو سراہا۔ اس موقع پر سردار جعفری نے مختلف زبانوں کے ادیبوں کے باہمی تعاون کو اپنا موضوعِ تقریر بنایا اور کہا کہ زبانوں اور ادب کو صحیح جادے پر ڈالنے ہی سے ملک میں قومی اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔

ان چاروں لیکچروں کی صدارت پروفیسر ایم آر پوری، وائس چانسلر جموں یونیورسٹی نے کی اور اپنی صدارتی تقریروں میں اُنھوں نے سردار جعفری کے علم و فضل، ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور ملک و قوم کے لیے اُن کی خدمات کو بھرپور خراجِ تحسین ادا کیا۔

جموں کے دانشور اور انگریزی اہلِ قلم بلراج پوری کی دعوت پر جعفری صاحب نے ایک لیکچر بھارتیہ وِدیا بھون کالج آف کمیونی کیشنز اینڈ مینجمنٹ میں ہندوستان کے تہذیبی ورثے کے موضوع پر دیا۔

اس سلسلے کا آخری لیکچر جو ڈاکٹر فاروق عبداللہ' چیف منسٹر جموں و کشمیر (پرو چانسلر جموں یونیورسٹی) کی زیرِ صدارت ابھینو تھیٹر میں ہوا' سردار جعفری کی یادوں کے متعلق تھا۔ اس کا عنوان تھا ''میری یادیں''۔ یہ لیکچر جو کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہا سردار جعفری کی علمی، ادبی اور سیاسی یادوں پر مبنی تھا۔ اور اس میں جعفری صاحب نے مشرق و مغرب کی نامور شخصیتوں کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کی رُوداد بڑے دِلکش انداز میں بیان کی۔ اس لیکچر میں سردار جعفری نے جن ہستیوں کا ذِکر کیا اُن میں رابندر ناتھ ٹیگور، پابلو نیرودا، لوئی آراگاں، ناظم حکمت، جگر مرادآبادی اور شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے سردار جعفری کی جموں یونیورسٹی میں آمد پر خوشنودی کا اظہار کیا۔

اس لیکچر کے بعد سردار جعفری کی بنائی ہوئی ڈاکومنٹری فلم ''اقبال'' دکھائی گئی جس کا انتظام ڈائریکٹر جنرل انفارمیشن' حکومتِ جموں و کشمیر نے کیا۔ اس فلم کی تشکیل و تکمیل میں

سردار جعفری پروڈیوسر کے طور پر، خواجہ احمد عباس ڈائرکٹر کے طور پر اور راقم التحریر ایڈوائزر کے طور پر شریک رہے۔

بمبئی کو روانگی سے قبل شعبۂ اُردو کی طرف سے جعفری صاحب کے اعزاز میں ایک الوداعی دعوت دی گئی جس میں وائس چانسلر اور رجسٹرار پروفیسر ایم آر راٹھور بھی شریک ہوئے۔ پروفیسر ایم آر پوری وائس چانسلر نے یونیورسٹی کی طرف سے ایک الوداعی ڈنر دیا اور ۳۱ ردسمبر کی سہ پہر کو جب ہم شعبۂ اُردو کے اساتذہ علی سردار جعفری کو جموں ائرپورٹ تک پہنچانے گئے تو راقم التحریر کو یہ شعر بار بار یاد آرہا تھا ؎

بزیرِ سایۂ گل خواستم کہ مے نوشم
زشیشہ تا بہ قدح ریختم بہار گزشت

جمیل الدّین عالیؔ

اگرچہ خیالات کے اِعتبار سے میں اِشتراکی ہوں لیکن مزاجاً فیوڈلزم اس کے آثار اور اس کے باقیات الصالحات سے مُجھے بے پایاں دلچسپی ہے۔ اور یہ دلچسپی لڑکپن کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔

مشاعروں میں بطور شاعر کے میری شرکت سولہ سترہ برس کی عمر میں شروع ہو گئی تھی اور اُس وقت بھی مُجھے پٹیالہ، کپورتھلہ، بہاولپور کے مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا تھا تو مُجھے خوشی اس بات کی ہوئی تھی کہ ان شہروں میں جا کر میں راجوں مہاراجوں اور نوابوں کے محل دیکھوں گا اور اگر تاجداروں کو دیکھنے کی صُورت بھی پیدا ہو جائے تو کیا ہی کہنا۔

الیف۔اے اور بی۔اے کی طالب علمی کے دوران میں جب میرا قیام راولپنڈی میں تھا تو "سرداروں کے باغ" کو میں اس لئے دیکھنے جایا کرتا تھا کہ یہاں حکومتِ ہند اور امیر امان اللہ خاں فرمانروائے افغانستان کے مابین معاہدہ ہوا تھا اور اُس موقعے پر اُس وقت کی ہندوستانی فوج نے امیر امان اللہ خاں کو اکیس توپوں کی سلامی دی تھی۔

مُرورِ ایام کے ساتھ میری اس دلچسپی میں اضافہ ہوتا گیا اور اس مزاجی کیفیت کی بدولت ہندوستان اور ہندوستان کے باہر متعدد بادشاہوں کے محلات اور اُن کے باغات کو میں نے پورے ذوق وشوق سے دیکھا' جن میں برطانوی، فرانسیسی، جرمن، نیپالی، وسط ایشیائی، مصری اور برمی تاجداروں کے محلات شامل ہیں۔

یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ذرا آگے تک جاتی ہے اور وہ یوں کہ آزادی کے بعد جب ہندوستان کے والیانِ ریاست تخت وتاج سے دستبردار ہوگئے تو اُن میں سے اکثر کے ساتھ میرے دوستانہ مراسم کی ابتداء ہوئی اور یہ مراسم اُن کی زندگی تک قائم رہے مثلاً ٹونک کے تاج دار نواب محمد اسمٰعیل خاں مرحوم اور والیٔ پٹودی نواب افتخار علی مرحوم۔

میری یہ مزاجی کیفیت آج بھی بدستور موجود ہے اور چند برس قبل جب میں رُوس گیا اور سوویت رائٹرز یونین کی صدر مریم سلگنیک نے مجھ سے پوچھا کہ آپ یہاں کیا کیا دیکھنا چاہیں گے اور کن کن لوگوں سے ملنا چاہیں گے تو میں نے جہاں شاعروں، ادیبوں، عالموں اور یونی ورسٹیوں کے نام لیے وہاں اس فہرست میں زارِ روس کے ونٹر پیلس اور سمر پیلس کو شامل کیا اور لینن گراڈ کے ونٹر پیلس کے اندر جب گھومتے گھومتے میں تھک گیا تو میں نے اپنے انٹر پریٹر الیگزینڈر سے یہ کہا کہ اَب آخر میں مجھے اس محل کے وہ کمرے دکھاؤ جو زارِ رُوس کے بیٹھنے کے، کھانے کے اور سونے کے کمرے تھے، بالخصوص کھانے کا وہ کمرہ جس میں لینن کی فوجوں نے زارِ روس اور اُس کے تمام وزراء کو گرفتار کیا، اور تاریخِ رُوس کا بابِ شہنشاہیت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔

شاید کوئی یہ سمجھے کہ شاہی خاندان اور اُن کے محلات اور باغات سے میری دلچسپی کا سبب تاریخ سے میری دلچسپی ہے تو یہ بات یوں صحیح نہیں کہ میں تاریخ کا ہمیشہ معمولی طالب علم رہا ہوں اور تاریخ کے واقعات کبھی ترتیب کے ساتھ میرے حافظے میں محفوظ نہیں رہے۔ لیکن شاہانہ عظمت اور جاہ وجلال کے ساتھ خواہ وہ کھنڈروں ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو میرا ایک عجیب وغریب

تعلقِ خاطر ہے اور میں اِس تعلقِ خاطر کو مزاجی کیفیت کے سوا اور کوئی نام نہیں دے سکتا۔

(۲)

ممکن ہے آپ یہاں یہ سوال کریں کہ اِس مضمون کا عنوان تو ہے جمیل الدین عالؔی اور میں یہ کیا تمہید لے بیٹھا ہوں تو اِس سلسلے میں کہنا مجھے یہ ہے کہ جہاں یہ تمہید ختم ہوتی ہے وہیں سے جمیل الدین عالؔی کا ذکر شروع ہوتا ہے۔

آزادی کے فوراً بعد کی بات ہے جمیل الدین عالؔی سے میری پہلی ملاقات دہلی میں ہوئی۔ اَب ٹھیک سے نہ تو مجھے مہینہ یاد ہے نہ سال اور یہ بھی نہیں معلوم کہ جمیل الدین عالؔی دہلی کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تھے یا کسی نجی کام کے سلسلے میں۔ اور یہ بھی ٹھیک سے یاد نہیں کہ ملاقات کنور مہندر سنگھ بیدی کے گھر میں ہوئی یا آپا حمیدہ سلطان کے گھر علی منزل میں، لیکن ملاقات ہوئی ان دونوں میں سے کسی ایک جگہ پر۔ میں اُس وقت تک جمیل الدین عالؔی کے نام سے تو واقف تھا لیکن اُن کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اَب اِتنا یاد آرہا ہے کہ حمیدہ آپا نے جب تعارف کرایا تو لوہارو خاندان کے حوالے سے نوابانِ لوہارو کا ذکر سنتے ہی میں چونکا اور لوہارو خاندان کے علمی اور ادبی کارنامے غالبیات کے پس منظر سمیت میری نظر کے سامنے پھر گئے اور اس وقت میرے رُوبرو صرف شاعر جمیل الدین عالؔی ہی نہیں تھے بلکہ شاعر جمیل الدین عالؔی میں سارا لوہارو خاندان مجھے نظر آرہا تھا، اِس حقیقت کے ساتھ کہ یہ خاندانِ لوہارو کے آخری شاعر ہیں۔

عالؔی کے اس قیامِ دہلی کے دوران میں ان کے ساتھ مجھے تین چار بار ملنے کا اتفاق ہوا اور انھی گنتی کی چند ملاقاتوں ہی میں عالؔی صاحب نے مجھے جگن بھائی کہہ کے خطاب کرنا شروع کیا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

جمیل الدین عالؔی کے اس سفر کی یہ بات بھی مجھے یاد ہے کہ جب عالؔی پاکستان واپس جانے لگے تو میں انھیں اسٹیشن پر پہنچانے گیا۔ ریل بہت دیر میں چلی اور میں ریل کے چلنے تک

اُن کے ساتھ گپ شپ میں مصروف رہا۔ اُس وقت تک ابھی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہوائی جہازوں کی آمدورفت شروع نہیں ہوئی تھی جو چند برس کے بعد دونوں ملکوں کی زندگی کا معمول بن گئی۔

(۳)

یہ غالباً ۴۸-۱۹۴۷ء کی بات ہے اور اُس وقت صورت یہ تھی کہ عالؔی کی شاعری کہیں نظر آجاتی تھی تو میں اسے شوق سے پڑھتا تھا۔ خاص طور سے اس کی تلاش نہیں رہتی تھی جیسے جوشؔ، جگرؔ، فراقؔ، حفیظؔ اور فیضؔ کا کلام میں رسائل میں ڈھونڈ ڈھونڈ کے پڑھتا تھا۔ عالؔی ان سب سے عمر میں بھی کم تھے بلکہ مجھ سے بھی عمر میں کم ہیں لیکن مذکورہ ملاقات (جو تین چار چھوٹی چھوٹی ملاقاتوں پر مشتمل تھی) ایک ایسے تعلقِ خاطر کا باعث بنی کہ میں عالؔی کا کلام بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کے پڑھنے لگا۔ اور اُن کے کلام میں مجھے وہی دلکشی نظر آئی جو میں نے اُن کی شخصیت میں دیکھی تھی۔ اُس وقت عالؔی کی شاعری کی ابتداء تھی لیکن اس ابتدائی دور میں بھی اس طرح کے اشعار وہ کہہ رہے تھے۔

ہائے یہ سیلِ رنگ و نور ہائے یہ لذتِ ظہور ۔۔۔۔۔ کچھ ترے نام کا سرور کچھ میری گرمیٔ کلام

اب جو یہ اعتراض ہے اتنے برس میں کیا کیا ۔۔۔۔۔ تیرے بغیر صبح و شام اپنے کہاں تھے صبح و شام

تم جو فقیر دوست ہو تم جو ہو صاحبِ نگاہ ۔۔۔۔۔ ہم بھی ہیں آلِ میر دردؔ ہم بھی ہیں صاحبِ مقام

ذہن تمام بے بسی رُوح تمام تشنگی ۔۔۔۔۔ سو یہ ہے اپنی زندگی جس کے تھے اتنے انتظام

جانتے ہیں تمام لوگ گو کوئی مانتا نہیں
سُن تو رکھا ہے تم نے بھی عالؔی دہلوی کا نام

☆☆☆

وہ آئے حضرتِ عالؔی بہ جیب و دامنِ چاک ۔۔۔۔۔ بہ زعمِ خود بڑے باہوش و صاحبِ ادراک

رہی خزاں میں تمنا کہ پھول چُن لیتے ۔۔۔۔۔ بہار آئی تو ہے دامنِ تمنا چاک

وہی تعلقِ خاطر ہے آج بھی تجھ سے ۔۔۔۔۔ بہ ایں حوادثِ ایام و گردشِ افلاک

اُدا نہیں ہے یہ ہے زندگی ان آنکھوں میں ۔۔۔۔۔ بہت حسین بہت مضطرب بہت غم ناک

ترے نثار مرے فن کی یوں نہ کر توصیف ۔۔۔۔۔ مرے یہ نقد و جواہر ترے خس و خاشاک

ہزار وہ سہی محبوب ہے مری ہی طرح
نظر خلوص مجسّم زباں بہت بے باک

گویا

بالائے سرش زہوشمندی ۔۔۔۔۔ می تافت ستارۂ بلندی

اور مجھے اُس وقت یہ اشعار اس لیے بھی پسند آئے تھے کہ ان میں اقبال کے آہنگ کی جھلک موجود تھی۔ میں آج بھی کلامِ اقبال کے سحرِ دلکشی کا اسیر ہوں لیکن اُس وقت میں اس بات کی اہمیت سے نا آشنا تھا کہ کسی شاعر کے کلام سے متاثر ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اُس کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کی جائے۔ یہ راز بعد میں مجھ پر کُھلا کہ شاعر کو اپنی آواز اور اپنا لہجہ دریافت کرنا چاہیے گویا اقبال کے اس مشورے کی اہمیت مجھے ذرا بعد میں آکے معلوم ہوئی کہ۔

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارِ نادر آید
گُنا ہے ہم اگر باشد ثواب است

لیکن عالؔی جی جادۂ نو کی تلاش میں شروع ہی سے مصروف رہے اور اُنھیں اپنا لہجہ اور اپنی آواز دریافت کرنے میں دیر نہ لگی۔ اُن کے اُسی زمانے کا شعر ہے۔

اُکتا گیا ہوں جادۂ نو کی تلاش سے
ہر راہ میں کوئی نہ کوئی کارواں ملا

اور بعد میں تو وہ دور آ گیا جب عالیؔ جی کا لہجہ ہی اُن کی اور اُن کی شاعری کی شناخت بن گیا۔ خواہ اُن کی غزل ہے یا نظم یا دوہے یا گیت۔

(۴)

وقت گزرتا گیا اور عالیؔ کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ بھی بڑھتا گیا۔ کبھی دہلی میں، کبھی لکھنؤ میں، کبھی لاہور میں، کبھی کراچی میں، کبھی متحدہ عرب اَمارات میں، کبھی امریکہ اور برطانیہ میں لیکن ہوا یوں کہ مُرورِ ایّام کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں ملاقاتیں کم ہوتی گئیں اور پاکستان میں بڑھتی گئیں۔ ہندوستان میں ملاقاتیں کم ہونے کا سبب یہ ہے کہ کچھ مدّت سے ہندوستان کے دو ایک اہم مشاعروں کے منتظمین میں بعض ایسے حضرات شامل ہو گئے ہیں جو مجھے اِن مشاعروں میں مدعو نہ کرنا ہی اَنسب سمجھتے ہیں۔ اس کا سبب مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا اور نہ ہی میں نے کبھی اس کے متعلق کسی سے پوچھا۔ لیکن چوں کہ عالیؔ جی کی ہندوستان میں آمد انھی اہم مشاعروں میں شرکت کے لیے ہوتی رہی اس لیے میں اُن کی ملاقاتوں سے محروم رہا۔ لیکن پاکستان میں صورت حال اِس کے بالکل برعکس ہے اس لیے عالیؔ صاحب سے زیادہ ملاقاتیں پاکستان ہی میں ہوئی ہیں۔

ایسی ہی ایک ملاقات جو بہت ہی خوبصورت تھی سیال کوٹ میں ۱۹۷۷ء میں ہوئی۔ ۱۹۷۷ء کا ذکر اس لئے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس سال پہلی اِقبال عالمی کانگرس منعقد ہوئی لاہور اور سیال کوٹ میں۔ میری نگاہ میں ۱۹۷۷ء کی اہمیت اِس لیے بھی بہت زیادہ ہے کہ ۱۹۶۵ء کی ہندو پاک جنگ کے بعد ابھی دونوں ملکوں کے تعلقات معمول پر آئے بھی نہیں تھے کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ نمودار ہو گئی اور ۱۹۷۷ء تک دونوں ملکوں

میں آمد و رفت بڑی حد تک معطّل رہی۔ مشاعروں اور سیمیناروں کی کیفیت یہ تھی کہ اس مدّت میں آٹھ دس دعوت نامے آئے لیکن اُن کے پیچھے پیچھے اُن کی منسوخی کے خطوط بھی آ جاتے تھے۔

تو اِقبال عالمی کانگرس میں شروع کے پانچ سات دِن تو سیمینار کے لیے وقف رہے اور آخری روز سیال کوٹ میں مشاعرہ ہوا۔ بعض دوستوں کے ساتھ سیمینار میں ملاقات ہوئی اور بعض کے ساتھ مشاعرے میں۔ عالیؔ صاحب کے ساتھ مشاعرے میں ملاقات ہوئی اور پہلی بار میں نے اُن کی زبان سے دوہے سُنے۔ جی خوش ہو گیا۔

اُس مشاعرے میں منتظمین نے مجھ ہیچ مدان کی عزّت افزائی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک ذرّے کو فرش سے اُٹھا کر عرش پر بٹھا دیا گیا ہو۔ میں اپنی بے علمی کی بنا پر شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا اور اہلِ پاکستان تھے کہ محبت کے خزانے مجھ پر نچھاور کر رہے تھے۔ صدارت کے ساتھ ہی مجھے یہ اعزاز بھی دیا گیا کہ میں اِقبال عالمی کانگرس کے منتظمینِ مشاعرہ کی طرف سے شعراء حضرات کی خدمت میں MEMENTOES بھی پیش کروں چنانچہ میں نے عالیؔ صاحب کی خدمت میں بھی اِقبال عالمی کانگرس کی جانب سے MEMENTO پیش کیا۔ یہ خود میرے لیے ایک اعزاز تھا کہ میں نے اِقبال عالمی کانگرس کے منتظمینِ مشاعرہ کی جانب سے فیضؔ صاحب، عالیؔ جی، قاسمی صاحب، منیر نیازی اور اپنے اُستادِ محترم صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ایسے کوہ وقار شاعروں کو MEMENTO پیش کیے۔

دو برس بعد کراچی میں ملاقات ہوئی۔ تقریب یہ تھی کہ پاکستان اکیڈیمی آف لیٹرز نے مجھے پاکستان آنے اور وہاں کی چار بین الاقوامی شہرت رکھنے والی یونیورسٹیوں' پنجاب یونیورسٹی لاہور، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد، پشاور یونی ورسٹی پشاور اور کراچی یونیورسٹی کراچی میں لیکچر دینے کی دعوت دی۔ اس کے ساتھ اور پروگرام بھی بہت تھے مثلاً

مختلف صوبوں کے رائٹرز گلڈز کی طرف سے استقبالیے وغیرہ۔ ایسا ہی ایک استقبالیہ رائٹرز گلڈز کراچی (یا شاید رائٹرز گلڈز سندھ) کی طرف سے کراچی آرٹس کونسل (یا شاید کراچی آرٹس کلب) میں منعقد ہوا۔ اُس میں عالیؔ صاحب اپنی مصروفیات کے باوجود تشریف لائے۔ جلسے، تقریروں اور شعر خوانی کے بعد کافی دیر تک اُن سے ملاقات رہی۔ وہ دہلی کی یادیں تازہ کرتے رہے اور میں لاہور، راولپنڈی اور کراچی میں اپنے ماضی کو آواز دیتا رہا۔

عالیؔ جی کے ساتھ کراچی کی ایک اور ملاقات میرے لئے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ میں انجمن سادات اَمروہہ کی ایک دعوت پر ایک مشاعرے اور سیمینار میں شرکت کے لئے کراچی گیا۔ عالیؔ صاحب نے اس موقعے پر اپنے گھر کھانے کی دعوت دی۔ وہاں جا کر دیکھا تو کوئی ستر، اسی یا سو کے قریب مہمان تھے۔ تمام کراچی کے برگزیدہ اہلِ قلم حضرات، شعراء، نثر نگار، یونیورسٹی کے اَساتذہ' گویا مشاعرے اور سیمینار میں جن حضرات سے سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی اُن سب سے ملاقات اس ڈنر میں ہو گئی۔

(۵)

امریکہ کے ایک سفر کا ذکر ہے۔ میں ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکاگو کی دعوت پر لیکچروں کے سلسلے میں وہاں گیا ہوا تھا۔ شکاگو کے دوران قیام میں امریکہ کی اُردو سوسائٹی کے سیکریٹری احمد خان صاحب نے بتایا کہ پاکستان کے شعراء جمیل الدین عالیؔ، قتیل شفائی، سید ضمیر جعفری، حمایت علی شاعر، پروین فنا سیّد، صہبا اختر اور چند اور شعراء مشاعروں میں شرکت کے لیے امریکہ اور کینیڈا کے دورے پر ہیں۔ اس سلسلے میں فلاں تاریخ کو شکاگو میں مشاعرہ ہے جس کا انتظام میں نے کیا ہے۔ اُنھوں نے مجھے اُس مشاعرے میں شرکت اور اس کی صدارت قبول کرنے کی دعوت دی۔ میرے لیے تو یہ مسرّت کا مقام بھی تھا اور اعزاز کا بھی' چنانچہ وقتِ مقررہ پر میں ڈاکٹر خورشید ملک کی معیت میں وہاں پہنچ گیا۔ اس مشاعرے کی قدرے مفصل رُوداد میں اپنے امریکہ کے

سفرنامے[1] میں بیان کر چکا ہوں۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ ایک بہت بڑا مشاعرہ تھا۔ سامعین میں ہندوستانی اور پاکستانی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ اب مجھے الگ الگ تو اندازہ نہیں کہ ہندوستانی کتنے تھے اور پاکستانی کتنے لیکن چوں کہ بنیادی طور پر اس مشاعرے میں پاکستانی شعراء ہی شریک تھے اور ان کے سفر کا انتظام بھی پاکستان کے ایک ادارے نے کیا تھا اس لیے ہوسکتا ہے کہ پاکستانی سامعین کی تعداد ہندوستانی سامعین سے زیادہ ہو۔ اس میں جمیل الدین عالیؔ نے اپنی نظم ''جیوے جیوے پاکستان'' پڑھی جسے سامعین نے بہت پسند کیا۔ یہ نظم یا گیت جب خاتمے کے قریب پہنچا تو عالیؔ صاحب نے کہا کہ جس قدر پاکستانی یہاں ہیں وہ میرے ساتھ اِس نظم کے مصرعے دہرائیں چنانچہ یہی ہوا اور ہال ''جیوے جیوے پاکستان'' کی مترنم آوازوں سے گونج اُٹھا۔ جب عالیؔ صاحب نظم پڑھ کے ڈائس پر آئے تو میں مائکروفون پر گیا اور وہاں اِس نظم کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہا کہ عالی صاحب نے یہ مطالبہ صرف پاکستانی سامعین سے کیوں کیا ہے کہ وہ اِس نظم کے مصرعے اُن کے ساتھ دہرائیں۔ میں بطورِ ایک ہندوستانی کے اِس بات کے لیے دعاگو ہوں کہ پاکستان زندہ و پائندہ رہے اور میں تو اُس ہندوستانی کو ہندوستانی نہیں سمجھتا جو پاکستان کی ترقی، خوشحالی اور پائندگی کا آرزومند نہیں —— شاید یہ فقرہ ابھی میں نے مکمل ہی نہیں کیا تھا کہ عالیؔ صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے اور آ کر بے اختیار مجھ سے لپٹ گئے اور کافی دیر تک اسی عالم میں رہے۔ اس وقت کا عالم قابلِ دید تھا۔ اب میں شاید اسے لفظوں میں بیان نہ کرسکوں۔ ہال تو خیر کافی دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عالیؔ صاحب نے امریکہ کی سرزمین پر ہندوستان اور پاکستان کی دوستی کی ایک ایسی تصویر پیش کی جو ابھی تک میرے دل پر ثبت ہے اور امریکہ کے اکثر پاکستانی اور ہندوستانی گھروں

[1] ''کولمبس کے دیس میں'' جو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔

میں اور لائبریریوں میں ویڈیو ٹیپ کی صورت میں بھی موجود ہے۔

دو ایک برس بعد پھر امریکہ میں ملاقات ہوئی۔ وہاں سے واپسی پر جب میں لندن پہنچا تو بی بی سی ٹیلی ویژن برمنگھم کی طرف سے انٹرویو ریکارڈ کرنے کی دعوت ملی۔ برمنگھم جانا میرے لیے دُشوار تھا کیوں کہ مجھے دُوسرے دن اپنی بیٹی، داماد اور بچّوں سے ملنے فروڈشم جانا تھا۔ اِس لیے بی بی سی ٹیلی ویژن برمنگھم نے کہا کہ ہم آپ کے انٹرویو کا انتظام بی بی سی ٹیلی ویژن لندن کے اسٹوڈیو میں کرلیں گے اور وہیں آپ کو بُلا لیں گے۔ یہ بات میرے لئے آسان تھی کیوں کہ اِس سے میرے فروڈشم کے پروگرام میں خلل نہیں پڑتا تھا۔

وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ عالی جی بھی موجود ہیں۔ بلکہ اُن کا انٹرویو شروع ہی ہونے والا تھا۔ انٹرویو شروع ہوا تو اس کی آواز باہر اُس کمرے میں بھی اسپیکر پر آرہی تھی جہاں میں بیٹھا تھا۔ ایک سوال عالی جی کے دوہوں کے بارے میں تھا۔ انٹرویو لینے والے نے پوچھا کہ ہندی آپ نے کہاں پڑھی۔ میں بھی اُن کے دوہوں کی بنا پر اِس خیال میں تھا کہ عالی جی نے قیامِ دہلی کے دوران میں ہندی پڑھی ہوگی۔ لیکن عالی جی کا جواب یہ تھا کہ میں ہندی سے نا آشنا ہوں۔ اُن کے دوہوں کی زبان پر بات ہوئی تو عالی جی نے کہا یہ میرا اپنا لہجہ ہے۔ میں دوہوں میں یہی زبان اِستعمال کرتا ہوں۔ یہ بات میرے لیے بھی حیرت انگیز تھی کیونکہ اس سے شاعری کی زبان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی تھی اور ساتھ ہی عالی جی کی قادرالکلامی کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔

اُسی سفر کی بات ہے قتیل صاحب لندن سے ہوکے گلاسگو (اسکاٹ لینڈ) چلے گئے۔ وہاں اُنھوں نے ایک مشاعرے کا اِنتظام کیا۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے مجھے اور عالی جی کو ٹیلی فون کیا مشاعرے میں شرکت کے لیے۔ لیکن میرے رستے میں فروڈشم کا سفر حائل تھا۔ عالی جی نے مجھ سے بہت کہا کہ ریل کا سفر ہے، چند گھنٹوں کا، دونوں اکٹھے چلیں گے رستے میں گپ شپ رہے گی۔ گلاسگو میں قتیل شفائی کے یہاں قیام کریں گے اس سے زیادہ عمدہ

سفر اور کیا ہوسکتا تھا۔ لیکن افسوس کہ عالی جی کے ساتھ یہ خوب صورت سفر نہ ہوسکا۔ میرے لیے فروڈشم (مغربی انگلستان) جانا ضروری تھا اِس لیے میں نے قتیل صاحب اور عالی جی سے مجبوراً معذرت کرلی۔ اور آج تک اس سفر میں عالی جی کی رفاقت سے محروم رہنے کی خلش دِل میں موجود ہے۔

کچھ برس بعد متحدہ عرب امارات میں ملاقات کا موقع ملا۔ تقریب تھی فیض صاحب کی یاد میں مشاعرہ، جو خلیل الرحمٰن صاحب کے تعاون سے عزیزِ محترم سلیم جعفری نے منعقد کیا تھا۔ مشاعرے کے بعد ابوظہبی، دوبئی اور شارجہ کی مختلف نشستوں میں اور زیادہ مفصل ملاقاتیں ہوئیں۔ روانگی سے قبل ''خلیج ٹائمز'' نے ہم میں سے اکثر شعراء کے انٹرویو لیے۔ عالی نے اپنے انٹرویو میں ہندوستان اور پاکستان سے باہر منعقد ہونے والے اُردو مشاعروں، وہاں کی اُردو تحریکوں، اُن کی افادیت اور اُن کے سامنے آنے والی مشکلات پر اِنتہائی عالمانہ انداز سے روشنی ڈالی۔ میں چوں کہ اپنا انٹرویو دینے کے بعد قریب ہی بیٹھا تھا اور ایک ایک لفظ سُن رہا تھا اِس لیے اِس نتیجے پر پہنچنے میں مجھے دیر نہ لگی کہ اس قدر پُر مغز اور دانشورانہ انٹرویو ہم میں سے شاید کسی اور شاعر نے نہیں دیا تھا۔

ابھی پچھلے برس کی بات ہے۔ میں کوئی ہفتے عشرے کے لیے کراچی میں تھا۔ ''دبستانِ لوح و قلم'' کے مشاعروں میں شرکت کے لیے۔ یوں تو برادرم مشفق خواجہ نے انجمن ترقی اُردو (پاکستان) کی جانب سے ابوالفضل صدیقی کی افسانہ نگاری پر ایک تقریر کی دعوت بھی دی اور میں نے بہ ذوق وشوق یہ تقریر کی لیکن چونکہ ہر رات کہیں نہ کہیں مشاعرہ منعقد ہوتا تھا اور چار پانچ بجے صبح سے پہلے ہوٹل میں واپسی نہ ہوتی تھی اس لیے قریب قریب سارا دن سونے اور آرام کرنے میں گزر جاتا تھا۔ دوستوں سے ملاقات مشکل ہوگئی تھی کیونکہ رات کے آٹھ بجے سے صبح کے پانچ بجے تک جاگنے کے بعد اتنی سکت ہی مجھ میں نہیں ہوتی تھی کہ کسی کو ٹیلی فون کرسکوں، کسی سے ملنے جاسکوں۔ میں پنچ لگژری ہوٹل میں

مقیم تھا۔ عالی صاحب کا دفتر بہت قریب تھا لیکن مسئلہ وہی تھا کہ میں صبح پانچ چھے بجے ہوٹل واپس آنے کے بعد سوجاتا تھا اور جاگنے کے بعد دُوسرے مشاعرے کی تیاری شروع ہوجاتی تھی۔

آخر ہندوستان واپس روانہ ہونے سے قبل عالی صاحب کے ساتھ ٹیلی فون پر بات ہوئی۔ اُنھوں نے دُوسرے دِن کے لیے کھانے کی دعوت دی اور کہا کہ میں خود آکر آپ کو یہاں سے لے جاؤں گا۔

دُوسرے دِن میں اُن کے اِنتظار میں بیٹھا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ عالی جی کا ٹیلی فون تھا کہنے لگے میں آگیا ہوں ہوٹل ہی سے بات کر رہا ہوں، نیچے بیٹھا ہوں۔ میں فوراً نیچے گیا۔ کہنے لگے بھئی طبیعت اچھی نہیں ہے اس لیے میں اُوپر نہیں آیا۔ ہم دونوں ہوٹل سے باہر نکلے تو میں نے دیکھا کہ عالی واقعی بیمار ہیں۔ میں نے کہا اِس عالم میں تو آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ مجھ میں آپ میں کوئی ایسا تکلف تو ہے نہیں' بلکہ آپ کو دفتر سے دو ایک دِن کی چھٹی لے کر گھر پر رہنا چاہیے۔ اِس پر اُنھوں نے علالت کی تفصیل سُنائی۔ عالی واقعی بیمار تھے' نہ معلوم اِس عالم میں وہ صبح سے شام تک دفتر کی ڈیوٹی کیسے انجام دے رہے تھے۔

وہ مجھے کراچی کے ایک بہت عمدہ ہوٹل میں لے گئے نام تو یاد نہیں لیکن یہ REVOLVING ہوٹل تھا۔ میں اِس میں ایک بار پہلے بھی جا چکا تھا۔ ایک برس قبل پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز نے اِسی میں دعوت کی تھی۔ وہاں پہنچے تو مشفق خواجہ ہم لوگوں کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ہم تینوں اُوپر گئے۔ لفٹ کے بعد ہوٹل کی بالائی منزل میں جانے کے لئے جو گھومتی رہتی ہے، چار پانچ سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ چار پانچ سیڑھیاں چڑھنا عالی صاحب کے لیے دُشوار تھا۔ اِس عالم میں اُنھوں نے مجھ سے ملنے کی زحمت کی تھی اور ایک ایسے ریسٹورنٹ میں کھانے کا اہتمام کیا تھا جہاں اُنھیں چند سیڑھیاں بھی چڑھنا پڑتی تھیں۔ مجھے اِس بات پر خوشی بھی تھی اور دُکھ بھی تھا۔ بہر طور کھانے پر کوئی دو گھنٹے کی محفل رہی

اور میں سمجھتا ہوں اُس محفلِ یاراں میں عالی صاحب کی طبیعت تھوڑی دیر کے لیے بحال ہوگئی۔

ہم لوگ کھانا کھا رہے تھے کہ پاکستان ٹیلی ویژن کے دو نامی فن کار، منور سعید اور قوی' جو میرے پسندیدہ بلکہ محبوب فن کار ہیں غالباً عالی صاحب سے ملنے ہوٹل میں تشریف لے آئے۔ اُن سے ملاقات ہوئی، جی خوش ہوا۔ گویا عالی صاحب کی بدولت منور سعید صاحب اور قوی صاحب سے بھی ملاقات ہوگئی اور یہ بھی کراچی کے سفر کا حاصل تھا۔

چند ماہ بعد پھر پاکستان کا سفر سامنے تھا۔ یوں تو یہ سفر لاہور، میاں چنوں اور کوئٹے کا تھا لیکن واپسی بہ راستہ کراچی ہوئی۔ اِس سفر میں عالی صاحب سے ملاقات نہ ہوسکی کیونکہ پروگرام کچھ ایسا بنا تھا کہ میں کوئٹے سے آتے ہوئے کراچی ایر پورٹ پر ایک طیارے سے اُترا اور لاہور پہنچنے کے لیے دُوسرے طیارے میں بیٹھ گیا۔ یہ بھی عزیزم محبوب عالم مدنی کی وجہ سے ہُوا ورنہ شاید یہ بھی ممکن نہ ہوتا۔ اِس سفر میں عالی صاحب سے ملاقات نہ کرنے کا دُکھ ہوا۔ اور اب جب کہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں حافظ کا یہ شعر میری زبان پر آرہا ہے

کشتی شکستگانیم اے بادِ شرطہ برخیز
باشد کہ باز بینیم آں یارِ آشنا را

ڈاکٹر قمر رئیس

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آرہا ہے کہ ڈاکٹر قمر رئیس سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی۔ نہ تاریخ یاد ہے نہ مہینہ نہ سال۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ جب میں پبلی کیشنز ڈویژن (نئی دہلی) کے شعبہ اُردو میں نائب مدیر[1] تھا تو ایک کم عمر کا لڑکا مجھ سے ملنے پبلی کیشنز ڈویژن میں آیا۔ اُس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہا کہ میرا نام قمر رئیس ہے اور میں شاہجہان پور سے آیا ہوں۔ میں نے اس سفر کا سبب پوچھا تو اُنھوں نے بتایا کہ شاہجہان پور میں ہم ایک مشاعرہ منعقد کر رہے ہیں اور میں اُس

[1] یہ جوش ملیح آبادی کے زمانے کی بات ہے۔ غالباً ۴۸، ۴۹ء یا ۵۰ء کی۔ آج کل علمی اور ادبی حلقوں میں اُس دور کے پبلی کیشنز ڈویژن اور اُس کے شعبہ اُردو کا ذکر ہوتا ہے تو پنڈت ہری چند اختر کا ذکر نہیں کیا جاتا اور نہ اُس پندرہ روزہ جریدے "کشمیر" کا جسے وہ مرتب کرتے تھے (اور جس پر جوش صاحب کی ہدایت کے مطابق "پانزدہ روزہ" لکھا جاتا تھا اور ہم لوگ بھی تو آپس میں پندرہ روزہ کہہ کر اُس کا ذکر کرتے تھے لیکن جوش صاحب کی موجودگی میں "پانزدہ روزہ" ہی کہتے تھے) تو ذکر ان دنوں "آج کل"، "بساطِ عالم" اور "نونہال" ہی کا ہوتا ہے۔ "کشمیر" پر پنڈت ہری چند اختر کا نام بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ بطور مدیر اس پر مولانا محمد سعید مسعودی کا نام آتا تھا۔ حکومتِ ہند کی یہی غلط پالیسیاں تھیں جن کا خمیازہ ہم آج بھگت رہے ہیں۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو مرکز میں آج بھی کشمیر پالیسی نام کا کوئی تصور نظر نہیں آتا۔

(آزاد)

میں آپ کو شرکت کی دعوت دینے آیا ہوں۔ میں نے یہ تو نہ کہا کہ اندھے کو اور کیا چاہئے، دو آنکھیں (اور شاعر کو اگر مشاعرہ ملے تو اسے اور کیا چاہئے) لیکن اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُوپر اُوپر سے کہا کہ آپ کو دہلی تک کے سفر کی زحمت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ مجھے خط لکھ دیتے میں حاضر ہو جاتا۔ اس پر اُنھوں نے کہا کہ مشاعرہ پرسوں ہے اور کل ہی رات کی ٹرین سے ہم دونوں کو شاہجہان پور جانا ہے۔ میں نے خوشی خوشی ہاں کر دی اور دوسرے دِن قمر رئیس اپنی قیام گاہ سے اور میں اپنے گھر سے پُرانی دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ قمر رئیس نے میرے لئے انٹر کلاس کا ٹکٹ لیا اور اپنے لئے تیسرے درجے کا۔ مجھے یہ بات اچھی نہ لگی کیونکہ میں ایک درویشانہ طبیعت کا آدمی ہوں اور جھوٹے قسم کے ٹھاٹھ باٹھ میں یقین نہیں رکھتا۔ ہم دونوں اکٹھا سفر کرتے چاہے وہ فورتھ کلاس ہی میں کیوں نہ ہوتا تو زیادہ مزے کی بات ہوتی۔

ساری رات کے سفر کے بعد دُوسری صبح کو ریل شاہجہان پور پہنچی۔ وہ زمانہ ہندوستان میں تیز رفتار ریلوں کا زمانہ نہیں تھا۔

ریل سے اُترنے کے بعد قمر رئیس مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے جہاں اُن کے والدِ محترم سے ملاقات ہوئی۔ اُن کے والدِ محترم ایڈوکیٹ تھے اور پیرانہ سالی کے باوجود ہر روز باقاعدگی سے عدالت جاتے تھے۔ مجھے اُن کے ساتھ صرف ناشتہ کرنے کا یا کھانا کھانے کا موقع ہی نصیب نہیں ہوا بلکہ اُن کی بحیثیت مجموعی خاموش طبیعت اور اُن کی گراں قدر باتوں دونوں سے فیض یاب ہونے کا موقع بھی مِلا۔ اُن کے ساتھ دو دِن کے قیام کے دوران میں اُن کے تعلق سے مجھے اکثر اقبال کا یہ مصرع یاد آتا رہا اور اب جب کہ اُن کے بارے میں یہ چند سطور میں لکھ رہا ہوں اقبال کا وہی مصرع پھر میرے حافظے میں تازہ ہو گیا ہے کہ

ع - بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق

مشاعرے میں شرکت کے بعد میں دہلی واپس آگیا اور قمر رئیس گھر میں رُک گئے۔

اب اس وقت یادداشت پوری طرح سے ساتھ نہیں دے رہی ہے لیکن خیال آتا ہے کہ

اُنھی دِنوں قمر رئیس نے دہلی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا (یا شاید ایم۔اے کیا تھا)۔ میں پبلی کیشنز ڈویژن میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا۔ دہلی میں تقسیم ہند کے بعد اُردو علمی اور ادبی سرگرمیاں از سرِ نو صورت پذیر ہورہی تھیں۔ پریم ناتھ در نے لاہور کی یاد تازہ رکھنے کے لیے حلقہء اربابِ ذوق کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کے زیرِ اہتمام ہفتہ وار جلسے دہلی کالج میں منعقد ہوئے تھے۔ اُس وقت دہلی کالج کے پرنسپل مرزا محمود بیگ تھے۔ اُردو کے سینئر لیکچرر ڈاکٹر عبادت بریلوی تھے جو تقسیمِ ملک کے کچھ مدّت بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ مکتبہء شاہراہ نے ''شاہراہ'' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا تھا جس کے پہلے مدیر ساحر لدھیانوی تھے۔ غالباً اس ادارے کے مالک یوسف جامعی کو ''شاہراہ'' نام کا ماہنامہ نکالنے کا خیال پہلے آیا ہوگا اور ادارے کا نام مکتبہء شاہراہ اُنھوں نے بعد میں رکھا ہوگا۔ دراصل تقسیمِ ہند کے بعد دہلی میں اُردو کے تعلق سے ادب میں ترقی پسند تحریک کا ظہور تو بڑی حد تک اسی مکتبہء شاہراہ کا مرہونِ منت ہے۔

اِنھی ادبی سرگرمیوں کی بدولت قمر رئیس کے ساتھ ملاقاتیں شروع ہوگئیں اور چند ہی دِنوں میں یہ ملاقاتیں دوستی میں تبدیل ہوگئیں۔ خُدا کا شکر ہے کہ یہ دوستی آج بھی اُسی طرح برقرار ہے۔

اِس مدّت میں قمر رئیس بھی ایم۔اے کرنے کے بعد دہلی یونیورسٹی ہی میں لیکچرر مقرر ہوگئے اور یونی ورسٹی ہوسٹل چھوڑنے کے بعد لکھنؤ روڈ پر ایک مکان میں منتقل ہوگئے تھے۔ کچھ مدّت بعد رشید حسن خان بھی اِسی مکان میں آگئے۔ گویا جب میں وہاں جاتا تھا تو قمر رئیس کے ساتھ ہی رشید حسن خان سے بھی ملاقات ہوتی تھی۔

ایک دِن کا ذکر ہے کہ میں' قمر رئیس اور رشید حسن خان چائے پی رہے تھے۔ گپ شپ کا سلسلہ جاری تھا کہ رشید حسن خان نے مُجھ سے سوال کیا کہ آزاد! آپ یہ بتائیں کے آپ کے نزدیک اقبال کی بہترین نظم کون سی ہے۔ میں نے کہا کہ تین نظمیں ایسی ہیں کہ اُن میں بہترین کا فیصلہ کرنا آسان نہیں اور وہ ہیں مسجدِ قرطبہ، ذوق وشوق اور ساقی نامہ۔ رشید حسن خان نے کہا اگر فیصلہ کرنا ضروری ہو تو؟..... تو میں نے کہا اُس صورت میں'' مسجدِ قرطبہ'' میرے نزدیک بہترین نظم

ہے۔ یہی سوال اُنھوں نے قمر رئیس سے کیا اور قمر رئیس نے بغیر کسی تمہید کے جواب دیا کہ میرے نزدیک ''ساقی نامہ'' بہترین نظم ہے۔ اب میں نے رشید حسن خان سے یہی سوال کیا تو اُن کی رائے بھی ''مسجد قرطبہ'' کے حق میں تھی۔ اِس موضوع پر تھوڑی سی بحث بھی ہوئی اور بات ختم ہوگئی۔

میں گھر واپس آیا تو مجھے خیال آیا کہ قمر رئیس کی ناقدانہ حیثیت مسلّم ہے اور کوئی نہ کوئی سبب تو ہوگا جس کے باعث اُنھوں نے ''ساقی نامہ'' کو بہترین نظم کہا ہے۔ مُجھے یہ تینوں نظمیں کلامِ اقبال کے اکثر اَور حصّوں کی طرح یاد تھیں لیکن نظم کو زبانی یاد رکھنے کا تعلق محض نظم کے صوتی آہنگ اَور اپنی مزاجی کیفیت سے ہے۔ نظم کے فکری تجزیے اَور فلسفیانہ گہرائی سے نہیں ہے۔ چنانچہ اِس خیال کے پیشِ نظر میں نے ''بالِ جبریل'' کو سامنے رکھ کے اِن دونوں نظموں کا بالاستیعاب مطالعہ شروع کیا۔ کئی دِن کے مطالعے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ''مسجد قرطبہ'' بے شک ایک میخانہء اِلہام ہے لیکن نظم ''ساقی نامہ'' ایک مقام پر آکر ایسی فلسفیانہ نزاکت اختیار کرلیتی ہے جو ہمیں نہ ''مسجد قرطبہ'' میں ملتی ہے اور نہ ''ذوق وشوق'' میں اَور یہ وہ مقام ہے جب اقبال خودی، رُوح اور بدن کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہیں اَور جہاں یہ اشعار آتے ہیں ؎

دمادم رواں ہے یمِ زندگی ہر ایک شے سے پیدا رمِ زندگی
اِسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دُود

اِس مقام پر اکثر قارئین Out of Context جب اِس شعر کو پڑھتے ہیں تو اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اقبال بدن کو شعلہ اور رُوح یا خودی کو موجِ دُود کہہ رہے ہیں۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اب ریل کے سفر میں میرے سامنے ''بالِ جبریل'' نہیں ہے کہ میں اِس حصّے کے اشعار یہاں لکھ کے اپنی بات کی وضاحت کرسکوں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال کے حُسنِ بیان کے ساتھ ہی ساتھ اسلوب کی تہ داری یہاں ایک ایسا مُعجزہ دکھارہی ہے جو ''مسجدِ قُرطبہ'' کے کسی حصّے

میں نظر نہیں آتا۔ جہاں تک ''مسجدِ قرطبہ'' کا تعلق ہے اس کے شعری محاسن کا تفصیل کے ساتھ ذکر اپنے انگریزی مقالے Aesthetics in Iqbal's Poetry[1] میں کر چکا ہوں لیکن ''ساقی نامہ'' کے فنی محاسن کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں لکھ سکا۔ اگر کبھی ''ساقی نامہ'' پر مضمون لکھنے کا موقع ملا یا فرصت مل گئی تو انشا اللہ اس میخانہ ءالہام کا ذکر بھی تفصیل سے کروں گا۔ یہاں تو میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ دونوں نظموں کا بار بار مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ قمر رئیس کیوں ''ساقی نامہ'' کو ''مسجد قرطبہ'' پر ترجیح دے رہے ہیں۔ اس امر کا قدرے تفصیلی ذکر اِسی مقالے میں اپنے مناسب مقام پر نظر آئے گا۔

میرے تین مجموعہ ہائے کلام ''بیکراں''، ''ستاروں سے ذرّوں تک'' اور ''وطن میں اجنبی'' جب شائع ہو چکے اور میں نے اپنا چوتھا اور پانچواں مجموعہ کلام بالترتیب ''نوائے پریشاں'' اور ''کہکشاں'' کے نام سے مرتب کیا تو ''نوائے پریشاں'' کا دیباچہ لکھنے کے لیے پروفیسر سید احتشام حسین سے درخواست کی اور ''کہکشاں'' کے لیے ڈاکٹر قمر رئیس سے۔ سید احتشام حسین مرحوم نے دیباچہ لکھ کے بھیج دیا جو ''نوائے پریشاں'' کے ہر ایڈیشن میں شامل ہے۔ ہندوستانی ایڈیشن میں بھی اور پاکستانی ایڈیشن میں بھی۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے ''کہکشاں'' کے لیے دیباچہ تاجیکستان سے لکھ کر بھیجا۔ اب ہوا یوں کہ ابھی میرے مرتب کیے ہوئے مجموعہ کلام ''نوائے پریشاں'' کی کتابت ہو رہی تھی کہ نریش کمار شاد نے جو اسٹار پبلی کیشنز کے غیر رسمی طور پر مشیرِ مطبوعات بھی تھے میرے کلام کا ایک انتخاب کر کے اسٹار پبلی کیشنز کو دے دیا جو ''کہکشاں'' ہی کے نام سے ایک روپیہ یا دو روپیہ سیریز میں شائع ہو گیا۔ اس کے چند ہی روز بعد میرا تبادلہ سری نگر ہو گیا اور سال ہا سال تک میری نظم و نثر کی کتابوں کی ترتیب و اشاعت کا کام میری سرکاری مصروفیات کی نذر ہوتا چلا گیا۔ قمر رئیس تاشقند سے واپس آئے اور اُنھوں نے ''کہکشاں'' دیکھی تو مجھ سے پوچھا کہ ''میرا وہ دیباچہ؟''

---

[1] یہ مقالہ اُس انٹرنیشنل کانفرنس کے لیے لکھا گیا جو برمنگھم یونی ورسٹی اور اقبال اکیڈیمی برطانیہ کے باہمی تعاون سے برمنگھم یونی ورسٹی برمنگھم میں گزشتہ برس Iqbal and the Fine Arts : Heritage of Islamic Creativity کے زیرِ عنوان منعقد ہوئی۔ اکیڈیمی کی فرمائش پر یہ مقالہ وہاں Key-note Address کے طور پر پڑھا گیا تھا۔

میں نے اُنھیں سارا واقعہ کہہ سنایا اور تفصیل سے بتایا کہ یہ وہ ''کہکشاں'' نہیں ہے جو میں مرتب کرنا چاہتا تھا۔ اُنھوں نے اس بات کی کوئی شکایت نہ کی کہ اُن کے دیباچے کا کیا ہوا۔ وہ میری کسی کتاب میں اِستعمال ہوگا یا نہیں لیکن مجھے اپنی جگہ شرمندگی رہی۔ اب مدّتوں تک میرا کوئی مجموعہ ءکلام شائع نہ ہوا اور میری یہ شرمندگی بھی بدستور رہی۔ قیامِ کشمیر کے دوران میں اِقبال پر تو مَیں نے کتابیں لکھیں اور وہ سری نگر، دہلی اور لاہور سے شائع ہوئیں۔ مثلاً ''اقبال اور مغربی مفکرین''، ''اقبال اور کشمیر''، ''مرقعِ اقبال'' اور ''فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو'' وغیرہ۔ شعر گوئی کی رفتار بھی کم نہیں رہی لیکن اُس دور میں ناشرین کی جانب سے اِقبال پر کتابوں کا مطالبہ زوروں پر رہا اس لیے میں کوئی مجموعہ ءکلام مرتب نہ کر سکا —— حتیٰ کہ مجوزہ اور موعودہ مجموعہ بہ عنوان ''کہکشاں'' بھی مرتب نہ ہو سکا۔ خدا کا شکر ہے اُنھی دِنوں میں محمد ایوب واقف نے ''جگن ناتھ آزاد: ایک مطالعہ'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جس کے مطالعہ ءغزل و نظم والے حصّے میں اُنھوں نے ڈاکٹر قمر رئیس کا گراں قدر مقالہ شامل کیا۔ واقف صاحب کے اِس عملِ حُسن کی بدولت میری ندامت میں کچھ کمی تو آ گئی لیکن اگر اُس زمانے میں وہ مجموعہ ءکلام چھپتا جس کا دیباچہ ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھا تھا اور اُس میں وہ دیباچہ شامل ہوتا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔

کشمیر میں قیام کے زمانے میں جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اِقبال اور اِقبالیات کے تعلق سے میں نے چھوٹی بڑی بہت کتابیں لکھیں اور مرتب کیں۔ اُن میں کچھ بچوں کے لیے تھیں۔ بچوں کے لیے اُن کتابوں میں دو کے نام تھے ''اقبال کی کہانی'' اور ''بچّوں کا اقبال''۔ ثانی الذکر کتاب ''بچوں کا اقبال'' میں نے ڈاکٹر قمر رئیس کے نام معنون کی اور ''اقبال کی کہانی'' کا ذکر ایک اور دوست سے کیا اور کہا کہ میں بچّوں کے لیے اس کتاب کا انتساب آپ کے نام کرنا چاہتا ہوں۔ اُنہوں نے کہا یہ تو چھوٹی سی کتاب ہے بچّوں کے لیے، کسی ضخیم کتاب کا انتساب میرے نام کیجیے۔ میں نے کہا کہ ضخیم کتابوں میں سے ''اقبال اور مغربی مفکّرین'' کا انتساب علی سردار جعفری کے نام ہو چکا ہے۔ ''اقبال اور کشمیر'' کا انتساب مالک رام کے

نام، "Iqbal: Mind and Art" کا انتساب پروفیسر خورشید ملک (امریکا) کے نام، "Iqbal: philosophy and Poetry" کا انتساب پریگارنیا نتاشا (سوویت یونین) کے نام، "محمد اقبال: ایک ادبی سوانح حیات" کا ڈاکٹر وحید قریشی اور محمد طفیل مدیر "نقوش" (پاکستان) کے نام اور "مرقعِ اقبال" کا انتساب ڈاکٹر جاوید اقبال (پاکستان) کے نام۔ اب نئی کتابیں اس وقت صرف دو ہیں "بچوں کا اقبال" جس کا انتساب ڈاکٹر قمر رئیس نے منظور کر لیا ہے اور دوسری ہے "اقبال کی کہانی" جس کے لیے میں نے آپ کو پیش کش کی ہے۔ وہ بپھر گئے اور کہنے لگے آپ قمر رئیس کا مقابلہ میرے ساتھ کر رہے ہیں۔ میں نے کہا میں اپنے دو دوستوں کا باہمی مقابلہ نہیں کرتا۔ اُن کا اپنا کام ہے اور آپ کا اپنا کام ہے۔ ع - ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است! لیکن آپ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ آپ کا کام آسمانی بلندیوں کو چھو رہا ہے......... وغیرہ وغیرہ۔

چند روز بعد میری ملاقات پروفیسر مسعود حسین خان سے ہوئی جو اُس زمانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ "اقبال کی کہانی" کے نام سے میری ایک چھوٹی سی کتاب چھپ رہی ہے جو میں نے بچوں کے لیے لکھی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا انتساب آپ کے نام کروں۔ اُنھوں نے کوئی سوال جواب کیے بغیر میری اس تجویز پر لبیک کہا اور اس کتاب پر یعنی جب کہ اس کے تین ایڈیشن یا شاید اس سے زیادہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں اُنھی کا اسم گرامی درج ہے۔

میرے کشمیر چلے جانے کے بعد ڈاکٹر قمر رئیس سے اور دہلی کے تمام دوستوں سے ملاقاتوں کا وہ لامتناہی سلسلہ ٹوٹ گیا جس کی ابتدا دہلی میں ہوئی تھی لیکن اسی مدّت میں قمر رئیس کے ساتھ ایک ملاقات سوویت یونین میں ہوئی۔ ڈاکٹر قمر رئیس انڈو سوویت کلچرل سوسائٹی کی جانب سے اور میں انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کی جانب سے قریب قریب ایک ہی تاریخوں پر ماسکو پہنچے لیکن ایک دوسرے کے پروگرام سے بے خبر تھے۔ قمر رئیس کو ٹالسٹائی کی ایک سو پچاسویں سالگرہ کی تقاریب میں شرکت کرنا تھی اور مجھے سوویت یونین کی چار یونی ورسٹیوں —— ماسکو یونی ورسٹی،

لینن گراڈ یونی ورسٹی، ریگا یونی ورسٹی (لیٹویا) اور یونی ورسٹی آف تاجکستان (دوشنبہ) —— میں لیکچر دینا تھے۔ اب انڈو سوویت کلچرل سوسائٹی اور سوویت رائٹرز یونین نے قمر رئیس کو اور مجھے، ہم دونوں کو اور بھی بہت سی تقریبات میں شامل کر لیا، مثلاً ٹالسٹائی صدی تقاریب کے ساتھ ہی ساتھ یانس رائیس کی ایک سو تیرھویں یومِ پیدائش کی تقاریب اور چند اور پروگراموں میں جن کی بدولت سوویت یونین میں ہمارا خاصا وقت اکٹھا گزرا۔ اِن ملاقاتوں کی تفصیل چونکہ میرے سفر نامے "پشکن کے دیس میں" شریکِ اشاعت ہے اس لیے اُسے اب یہاں دہرانا لاحاصل ہے۔

اب ان دنوں ملاقاتوں کی جگہ خط و کتابت نے لے لی ہے۔ یہ خط و کتابت پہلے "عصری آگہی" کی بدولت زندہ و سلامت تھی اور اب خدا کے فضل سے "نیا سفر" کی بدولت زندہ و سلامت ہے۔ اس خط و کتابت میں اکثر میں قمر رئیس کی اُسی بے تکلفی اور اُسی بے ساختہ پن سے محظوظ ہوتا رہا ہوں جو اُن کے ساتھ قیامِ دہلی کی ملاقاتوں میں مجھے حاصل تھی۔ اب اس وقت مجھے بات تو یاد نہیں اور اس کا سیاق و سباق بھی اور قمر رئیس کا پورا جملہ بھی، لیکن ایک خط میں اُنھوں نے مجھے لکھا "جب تک تمہارے سر پر اقبال کا بھوت سوار ہے............" اس کے آگے یاد نہیں کہ کیا لکھا تھا لیکن اتنا یاد ہے کہ مذکورہ جُملہ مجھے بہت پسند آیا تھا۔

اقبال ادبی مرکز کے سیمناروں میں شرکت کے لیے بھوپال میں ہماری اکثر باہمی ملاقاتیں رہیں۔ ہمارا انتظام بھی ہمیشہ ایک ہی ہوٹل میں ہوتا تھا۔ اور سیمنار سے پہلے اور بعد میں ایک دوسرے کے ساتھ کبھی اُن کے کمرے میں، کبھی میرے کمرے میں، گپ شپ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ ایک ایسے ہی سفر کا ذکر ہے۔ ہم دونوں کے کمرے آمنے سامنے تھے۔ میں سیمنار کے لیے تیار ہو کر ان کے کمرے میں گیا۔ وہ ابھی تیار ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُنہوں نے کہا ہم جوش صاحب پر ایک سیمنار منعقد کر رہے ہیں۔ جوش پر آپ کا ایک مقالہ میں نے حال ہی میں پڑھا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ نے جوش صاحب کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اب آپ کو ایک مقالہ لکھنا ہے لیکن ویسا نہیں جیسے پہلے لکھا ہے اور اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے باضابطہ دعوت نامہ

جو وہ میرے لیے اپنے ساتھ لائے تھے بریف کیس سے نکال کے میرے حوالے کر دیا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ شکایت مجھ سے محمد حسن بھی کر چکے ہیں اور میرے جس مقالے کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ میں نے سرور صاحب کی فرمائش پر لکھا تھا۔ اُس کا عنوان اُنھی نے دیا تھا ''اقبال اور جوش''۔ اور جب اقبال اور جوش کا تقابلی مطالعہ ہوگا تو ظاہر ہے پلڑا تو اقبال ہی کا بھاری رہے گا۔ کہنے لگے اگر ہم اقبال کو خارج از بحث قرار دے دیں تو پھر اُردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ میں نے کہا غالب، میر تقی میر اور میر انیس۔ اس پر اُنھوں نے کہا آج کے دور میں اقبال کے بعد بڑا شاعر کون ہے۔ میں نے جواب میں کہا بڑا شاعر ہر دور میں پیدا نہیں ہوتا۔ آج اقبال کے بعد بڑا شاعر کوئی نہیں ہے۔ ہاں اچھے اور بہت اچھے شعرا ہیں۔ بولے تو سب سے اچھا شاعر کون ہے۔ میں نے کہا پھر تو جوش صاحب ہی ہیں۔ کہنے لگے تو پھر سب سے اچھے شاعر پر آپ کو مقالہ لکھنا ہے۔ یہ باتیں اُنھوں نے بڑے جاہ و جلال کے ساتھ کہیں' سمینار کے مقام اور تاریخ سے مُجھے آگاہ کیا۔ مقام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر تھا۔ ''جوش کے کلام میں فکری عناصر'' کے زیرِ عنوان میں نے مقالہ لکھا اور سمینار سے قبل قمر رئیس صاحب کو وُہ مقالہ بھیج دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ جس تاریخ کو سمینار ہے اُسی تاریخ کو مجھے کراچی کے ایک سمینار اور لاہور کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے دہلی سے روانہ ہونا ہے اس لیے (اگر میرا مقالہ پسند ہو) تو میری گذارش یہ ہے کہ میرا مقالہ ایک بجے تک مُجھ سے پڑھوالیں۔ اُنھوں نے جواب میں مقالے کے متعلق اپنی پسندیدگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ایک بجے تک آپ کا مقالہ پڑھوالیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جب اُنھوں نے یہ مقالہ ''نیا سفر'' میں بھی شریکِ اشاعت کیا اور اُس کتاب میں بھی جو اُنھوں نے جوش صاحب کے متعلق مرتب کی ہے تو مجھے یقین آگیا کہ اُنھیں اب مُجھ سے یہ شکایت نہیں رہی کہ میں نے جوش صاحب کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔

(۲)

زیرِ نظر مقالے کا اُوپر کا حصہ ۸ر اگست ۱۹۹۶ء کو دہلی سے حیدر آباد جاتے ہوئے ریل کے

سفر میں لکھا گیا۔ ایک تو میں خاصا بد خط واقع ہوا ہوں۔ دُوسرے چلتی ریل میں لکھا ہوا مقالہ میں خود بھی بعد میں بآسانی نہیں پڑھ سکتا، کسی اور کو صاف کرنے کے لیے کیا دیتا۔ مُجھے مقالے کو صاف کرنے کی فرصت نہ ملی اور اس دوران میں ڈاکٹر سلمیٰ شاہین کے تین خطوط موصول ہوئے کہ قمر رئیس نمبر کے لئے (یا اب ٹھیک سے یاد نہیں شائد قمر رئیس پر زیرِ ترتیب کتاب کے لئے) مقالہ انھیں جلد درکار ہے۔

بہر طور اب جب کہ یہ مقالہ میں صاف کر رہا ہوں اس میں دو امور کا اضافہ ضمیمے کے طور پر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک تو ''ساقی نامہ'' کے اُس حصے کے بارے میں ہے جس کا ذکر محض اشارۃً میں نے زیرِ نظر مضمون کے حصہ اوّل میں کیا ہے اور دُوسرا ادب کی ترقی پسند تحریک کے تعلق سے قمر رئیس کے بارے میں دو ایک الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔

(۳)

''ساقی نامہ'' کا مذکورہ بند اِنتہائی آسان زبان میں ہونے کی وجہ سے ہماری فکر کو فوری طور پر گرفت میں نہیں لیتا۔ اگر یہ مُشکل زبان میں ہوتا جیسے The Reconstruction of Religious thoughts in Islam کی زبان مُشکل ہے تو ہم اس سے لُطف اندوز ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اس پر پوری طرح غور بھی کرتے۔ لیکن ہم چونکہ اس بند کے صوتی آہنگ کی لہروں کے ساتھ بہتے چلے جاتے ہیں اس لیے اِس کی گہرائی تک پہنچنے کے عوض ہم اِس طرح لذّت اندوز ہوتے چلے جاتے ہیں جس طرح ایک غیر فلسفیانہ، خوبصورت اور مترنّم نظم سے۔ اِس ایک بند کی نزاکتِ بیان فلسفیانہ اعتبار سے اِس نظم کو ''مسجد قُرطبہ'' اور ''ذوق و شوق'' دونوں سے ممتاز کر رہی ہے۔ ''مسجد قُرطبہ'' اور ''ذوق و شوق'' کو ہم اُس معنی میں فلسفیانہ نظم نہیں کہہ سکتے جس معنی میں ''ساقی نامہ'' ایک فلسفیانہ نظم ہے۔

اس بند میں اِقبال نے زندگی کو ثابت بھی کہا ہے اور سیّار بھی۔ یعنی زندگی ثابت ہے یا

دوسرے لفظوں میں مشخص ہے اور سیار ہے کہ یہ ہر وقت حرکت میں رہتی ہے اور اس میں ارتقا کی کیفیت موجود ہے۔[1] اس بند میں اقبال اتنا ہی کہہ کر

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی — عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں — کہ تُو میں نہیں اور میں تُو نہیں

ایک لمبی مفکرانہ جست لگا کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہر شخص اپنے آپ کو مغائرالوجود تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے باوجود

من و تو سے ہے انجمن آفریں — مگر عین محفل میں خلوت نشیں

یعنی فرد اپنے آپ کو مغائرالوجود تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے باوجود سماجی اور اجتماعی زندگی کی بنیاد بھی فرد ہی ہے اور ہر شخص ہی اپنی انفرادیت کی بنا پر خلوت نشیں بھی ہے — اور قدرے وضاحت کے ساتھ یہی بات اُنھوں نے "بالِ جبریل" میں کہی ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں

اس لیے بعض شارحینِ کلامِ اقبال کا یہ کہنا کہ بدن کے شعلے میں زندگی یا خودی کی موجِ دُود پوشیدہ ہے' اُس فلسفیانہ نکتے سے بہت دُور چلے جانے کے مترادف ہے جو اقبال بیان کر رہے ہیں۔

اس بند کی اور اس سے بعد کے بند کی تشریح کے لئے اور اس کی فکری گہرائی تک پہنچنے کے لیے اور حسنِ بیان سے لذت اندوز ہونے کے لیے ایک نظر "گلشنِ راز جدید" پر ڈالنا ضروری ہے جس میں اقبال اس قدر اختصار کے ساتھ نہیں بلکہ وضاحت سے کہہ رہے ہیں ؎

درونِ سینۂ آدم چہ نُور است — چہ نُور است این کہ غیب او حضور است

---

[1] For a concious being, to exist is to change, to change is to mature, to mature is to go on creating one's self endlessly ———— Bergson.

من او را ثابت و سیار دیدم — من او را نُور دیدم، نار دیدم

گہے نارش ز بُرہان و دلیل اَست — گہے نورش ز جانِ جبرئیل اَست

بہ خاک آلودہ و پاک از مکان اَست — بہ بندِ روز و شب پاک از زمان است[1]

گویا زندگی متضاد خواص کی حامل ہونے کے باوجود ایک وحدت ہے۔ زندگی کی یہ وحدت مظاہر کی کثرت میں قدم قدم پر نمایاں ہے اور جب اقبال کہتے ہیں ؎

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود — کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دُود

تو وہ زندگی کو شعلہ کہہ رہے ہیں اور بدن کو موجِ دُود۔

(۴)

ادب کی ترقی پسند تحریک اس وقت جس عالم میں ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ جدیدیت کے رجحان (یا تحریک) کی ابتدا ہی سے اکثر اہلِ قلم حضرات نے ترقی پسند تحریک سے قطعِ تعلق کرنا شروع کر دیا تھا۔ جو کمی رہ گئی تھی وہ سوویت یونین کا شیرازہ بکھرنے کے ساتھ پوری ہو گئی لیکن اس عالم میں جنھوں نے وفاداری بہ شرطِ اُستواری کو جزوِ ایمان سمجھا اُن میں قمر رئیس کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے اور مجھے یقین ہے کہ مُرورِ ایّام کے ساتھ ادب کی ترقی پسندی کے تعلق سے قمر رئیس کے نام اور کام کی اہمیت کم نہیں ہو گی بلکہ ہمیشہ بڑھتی چلی جائے گی اور اس بنا پر میں اُن کے نام اور کام کو سلام کرتا ہوں۔

---

[1] اللہ اللہ! آدم کے سینے کے اندر کیا نُور پوشیدہ ہے! یہ (بظاہر) نظر نہ آنے والا نُور (حقیقتاً) ہمارے سامنے موجود ہے۔ میں نے اس نُور کو سکون و ثبات کے عالم میں بھی دیکھا ہے اور حرکت و ارتقاء کے عالم میں بھی۔ میں نے اِس کو (رُوحانی) تجلّی کے رنگ میں بھی دیکھا ہے اور آگ (کی روشنی) کی صُورت میں بھی (تو میں یہ دیکھتا ہوں کہ) بُرہان و دلیل سے اُس کی آگ وجود میں آگئی ہے اور کبھی یہ کہ اُس کی (رُوحانی) تجلّی اُسے جبرئیل کی رُوح سے حاصل ہو گئی ہے۔ وہ آلودۂ خاک ہے (یعنی خاک سے پیدا ہُوا ہے) لیکن آلودگیِ مکاں (عالمِ آب و خاک و باد کی آلودگی) سے پاک ہے اور روز و شب کی گردش کا اسیر ہونے کے باوجود اس سے آزاد ہے۔

سلیم جعفری

(ہندو پاکستان میں دوستی کا پُل)

متحدہ عرب امارات کے مشاعروں میں شرکت کے لیے مجھے کوئی چھ بار اس ملک میں جانے کا موقع ملا ہے۔ پہلے تین مشاعروں میں شرکت کی دعوت مجھے جن اداروں نے دی اُن کے نام اِس وقت حافظے میں نہیں ہیں لیکن دُوسرے تین مشاعروں کی دعوت سلیم جعفری صاحب کی جانب سے ملی۔ اب سَن تو یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ ان تین مشاعروں میں پہلا مشاعرہ فیض احمد فیض کی یاد میں منعقد ہوا تھا اور اس کی صدارت علی سردار جعفری نے کی تھی۔

سلیم جعفری صاحب سے میری پہلی ملاقات اسی مشاعرے میں ہوئی اور اس پہلی ملاقات ہی میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ سلیم جعفری مشاعرے کے انتظام کرنے میں جس میں شعراء کے انتخاب کا کام بھی شامل ہے اور ہر اعتبار سے مشاعرے کو انتہائی بلندی تک پہنچانے

میں جو مہارت رکھتے ہیں وہ کم لوگوں کے حصے میں آئی ہوگی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس مشاعرے میں اسٹیج سیکریٹری یا میرِ مشاعرہ کے فرائض ملک زادہ منظور احمد یا حمایت علی شاعر نے انجام دیے تھے۔ سلیم جعفری کا یہ کمالِ فن کہ مشاعرے کو کامیابی کے ساتھ کیسے چلایا جا سکتا ہے اس وقت تک میرے مشاہدے میں نہیں آیا تھا۔

اس مشاعرے کے تین چار ماہ بعد میں کراچی کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے پاکستان گیا۔ لاہور میں بردار بجان برابر قتیل شفائی سے ملاقات ہوئی۔ چند برس قبل قتیل صاحب اور راقم التحریر ابوظہبی اور العین کے مشاعروں میں شریک تھے۔ یہ مشاعرے سلیم جعفری صاحب کے زیرِ اہتمام نہیں تھے۔ لاہور کی اس ملاقات میں دبئی کے مذکورہ مشاعروں کا ذکر آیا تو بات سلیم جعفری کے ذکر تک پہنچی۔ گویا بات پہنچی تری جوانی تک اور اثنائے گفتگو میں، ظاہر ہے کہ سلیم جعفری صاحب کے حسنِ انتظام اور مہمان نوازی کا بھی ذکر ہوا۔ بات چیت کے دوران میں قتیل نے پوچھا۔ ''آزاد! تمھیں معلوم ہے کہ سلیم جعفری ہمارے عزیز دوست ذکر الرحمٰن کے داماد ہیں۔'' میں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور ساتھ ہی مسرّت اور حیرت کا بھی کہ اتنا قریب کا رشتہ اور میں اس سے بالکل بے خبر ہوں۔ انسان کی لاعلمی کی بھی کوئی انتہا نہیں!

اب ذکر الرحمٰن صاحب کی بات ہے کہ ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک جب کہ ہم لوگوں کا قیام راولپنڈی میں رہا تو میرے مراسم فضل الرحمٰن اشک، ذکر الرحمٰن، محبوب الرحمٰن اور ان کے ایک اور بھائی کے ساتھ سگے بھائیوں کے سے تھے۔ میں اگرچہ ۱۹۳۷ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد لاہور آگیا تھا لیکن گھر تو میرا راولپنڈی میں تھا۔ والدین اور چھوٹی بہنیں وہیں تھیں ل لیے راولپنڈی مہینے میں دو ایک بار جانا ہوتا ہی تھا۔ اور وہاں میرا زیادہ تر وقت ایشیاٹک پٹیکل ورکس میں گزرتا تھا۔ ایشیاٹک آپٹیکل ورکس راولپنڈی صدر میں عینکوں کی بڑی لمبی ڑی دُکان تھی جو سارے خاندان کی مشترکہ ملکیت تھی اور غالباً اب بھی ہے۔ اُس وقت اشک، ، محبوب اور چوتھے بھائی وہاں کام کرتے تھے۔ اب ایشیاٹک آپٹیکل ورکس کی ایک شاخ

کراچی میں ہے اور ذکر صاحب اور جس چوتھے بھائی کا نام مجھے یاد نہیں رہا وہاں کام کرتے ہیں۔ اشک صاحب اور محبوب صاحب اِس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔

ع۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

تو بات دبئی کے اس مشاعرے کی ہو رہی تھی جو فیض صاحب کی یاد میں منعقد ہوا تھا۔ غالباً دبئی کے بعد ایک مشاعرہ سلیم جعفری صاحب ہی کی بدولت دُوسری یا تیسری رات کو ابو ظہبی میں بھی منعقد ہوا اور پھر ایک مشاعرے کا اِنتظام سلیم جعفری نے بحرین میں کیا۔ اس میں وہ خود تو بر بنائے مصروفیت شریک نہ ہو سکے لیکن اُنھوں نے ہم میں سے چند شعراء خمار بارہ بنکوی، حمایت علی شاعر، جون ایلیا، ملک زادہ منظور احمد، جمیلہ گپتا، بشیر بدر اور راقم التحریر کے لیے دعوت نامے بحرین سے منگوا لیے۔ بحرین کے مشاعرے کا ذکر میں یہاں برائے وزنِ شعر پیش نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ سلیم جعفری نے صرف متحدہ عرب امارات ہی میں مشاعرے کی شمع روشن نہیں کی بلکہ اس شمع کا نور مشرقِ وسطیٰ میں دُور دُور تک پھیلایا ہے جس کی بدولت اُردو کی مقبولیت بھی دُور دُور تک جا پہنچی ہے اور دُنیا بھر میں رہنے والے اُردو شعراء کو بھی ایک پلیٹ فارم پر آ کر ایک دُوسرے سے ملنے کے مواقع میسّر آئے ہیں اور آتے رہیں گے۔

سلیم جعفری کراچی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طالب علم ہیں اور فیض صاحب کی یاد میں مذکورہ مشاعرہ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی جانب سے منعقد ہوا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے کرتا دھرتا سلیم جعفری ہی تھے۔ شاید مشاعرے سے قبل اس صورت حال پر بعض لوگوں نے پس پردہ اس قسم کا تبصرہ بھی کیا تھا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کا فیض صاحب سے کیا تعلق؟ ہم شعراء میں سے میرے اور سردار جعفری کے سوا اور کسی کو اس اعتراض کا علم نہیں تھا۔ غالباً سلیم جعفری ہی نے سردار جعفری سے بھی جنھیں اس مشاعرے کی صدارت کرنا تھی، اس بات کا ذکر کیا ہوگا۔ سردار جعفری نے اپنی دانشوری اور تقریر کے فن میں اپنی مہارت کی بنا پر اپنے پہلے ہی جملے سے صورتِ حال کو سنبھال لیا۔ اُنھوں نے اپنی تقریر یوں شروع کی:

''فیض علی گڑھ یونی ورسٹی میں نہیں پڑھے لیکن
علی گڑھ نے فیض کو پڑھا ہے.........''

مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت تک کراچی یونی ورسٹی کے اولڈ بوائز کی ایسوسی ایشن یونی کیریز انٹرنیشنل معرضِ وجود میں آ چکی تھی یا نہیں۔ اس کے بعد سلیم جعفری صاحب کے زیرِ اہتمام مشاعرے یونی کیریز انٹرنیشنل کے بینر کے ساتھ منعقد ہونا شروع ہو گئے اور خاص اس التزام کے ساتھ کہ ایک سال پاکستان کے شاعر کا جشن منایا جائے گا جس کی صدارت ہندوستان کا شاعر کرے گا اور دُوسرے سال صدارت کرنے والے ہندوستانی شاعر کا جشن منایا جائے گا جس کی صدارت پاکستان کا شاعر کرے گا۔ یہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی کی فضا پیدا کرنے کی ایک نہایت عمدہ کوشش تھی اور ہے اور اِس کے خوش گوار نتائج آج نہیں تو انشاء اللہ کل نمودار ہوں گے۔

میں نے اپنے ایک مضمون ''یونی کیریز انٹرنیشنل کے مشاعرے'' میں سلیم جعفری صاحب کی اس کوشش کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے۔ یہاں اُس کا ایک اِقتباس درج کیا جا رہا ہے:

''اُن مشاعروں میں International
Unikarians کا مشاعرہ جو باقاعدگی کے ساتھ متحدہ عرب امارات
میں کئی برس سے ہر سال مئی کے مہینے میں منعقد ہو رہا ہے بڑی
اہمیت کا حامل ہے۔ اس وقت ہم اُردو شعراء اور اُردو کے اہلِ قلم
کے لئے ایک اُداس کر دینے والا مسئلہ ہے ہندوستان اور پاکستان
کے باہمی تعلقات کا مسئلہ۔ پاکستان کا ملک معرضِ وجود میں آیا تو
اس لیے تھا کہ دو بھائی اگر ایک مکان میں اکٹھے نہیں رہ سکتے تو
مکان تقسیم کر لیں تا کہ ان کے باہمی جھگڑے ختم ہو جائیں اور وہ
زندگی ایک دوستانہ ماحول میں بسر کر سکیں لیکن حقیقتاً صورتِ حال

یہ ہے کہ مکان کو تقسیم کر لینے کے باوجود دوستی کی وہ فضا پیدا نہیں
ہوئی جو ہونا چاہئے تھی۔ دوستی کی فضا نہ سیاست کے میدان میں
پیدا ہو سکی ہے نہ تجارت کے میدان میں۔ اگر چہ فضا پیدا ہوئی ہے
تو کسی حد تک کھیل کے میدان میں اور خاصی حد تک مشاعروں
کے میدان میں اور مشاعروں کے ذریعے سے فضا کو ہموار بنانے
کا جو عظیم کام International Unikarians اور اس کے صدر
محترم سلیم جعفری صاحب نے انجام دیا ہے اور انجام دے رہے
ہیں وہ صرف تاریخ ادب ہی میں نہیں بلکہ تاریخ برصغیر میں بھی
سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

صرف یہی نہیں کہ اس مشاعرے میں ہر سال
شرکت کے لیے دونوں ملکوں کے نمائندہ شعراء کو مدعو کیا جاتا ہے
بلکہ یہ امر بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ ہر سال ایک شاعر کا جشن
منایا جائے اور اس طرح سے کہ اگر ایک سال پاکستان کے شاعر
کا جشن منایا جائے تو دُوسرے سال ہندوستان کے شاعر کا۔ اور
یہ سلسلہ اسی طرح باری باری چلتا رہے۔ ساتھ ہی اس کے یہ بھی
ایک طے شدہ امر ہے کہ جس سال پاکستانی شاعر کا جشن منایا
جائے اُس سال تمام مشاعروں کی صدارت ہندوستانی شاعر
کرے۔ یہ بڑے غور سے دیکھنے کی بات ہے۔ اس سے سرسری
گزر جانے پر ہم اس امر کی پوری اہمیت سمجھنے سے قاصر رہ جائیں
گے۔ ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات اس وقت ایک
اُتار چڑھاؤ کے دور سے گزر رہے ہیں۔ سیاست دانوں سے

چھوٹے بڑے مسائل حل ہونے میں نہیں آ رہے ہیں۔ اس وقت
دونوں ملکوں میں مؤدت کا رشتہ اگر کسی ذریعے سے باقی ہے تو وہ
ذریعہ مشاعرہ ہے اور مشاعروں میں یونی کیئرنز انٹرنیشنل کا یہ
مشاعرہ اس فرض کو جس حسن اور خوبی سے ادا کر رہا ہے وہ صرف
متحدہ عرب امارات ہی کا نہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان کی
تاریخ کا بھی حصہ بنتا جا رہا ہے۔

ان مشاعروں کے انعقاد کے علاوہ یونی کیئرنز
انٹرنیشنل کا ایک اور اہم کام یہ ہے کہ وہ بعض قابلِ قدر شعراء کو
اپنا مجموعہ کلام چھاپنے کے اخراجات بھی مہیا کرتی ہے، اور اس
سے زیادہ اہم فریضہ جو یونی کیئرنز انٹرنیشنل نے اپنے ذمہ لے
رکھا ہے یہ ہے کہ ان پختہ کلام اور استاد شعراء کی نگارشات کو،
جن کا کلام فنِ شعر کی انتہائی بلندیوں کو چھو رہا ہے، لیکن جو بہ وجوہ
اپنی زندگی میں شہرت یا ناموری حاصل نہ کر سکے اور اُن کا کلام
مطبوعہ مجموعوں کی صورت میں اہلِ نظر کے سامنے نہ آ سکا کتابی
صورت میں شائع کر کے سخن سنج اور شائقینِ سخن کے سامنے لایا جا
سکے۔ یہ ایک طرح سے اُن حق دار شعراء تک اُن کا حق پہنچانے
کی کوشش ہے جو زندگی میں اپنا حق نہ پا سکے اور ظاہر ہے کہ شاعر
کی قدر شناسی کی عمدہ ترین صورت تو یہی ہے کہ اس کا مجموعہ
ء کلام قاری کے سامنے موجود رہے جب اس کا جسدِ خاکی
دُنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہو۔ اُستاد ذوق نے کیا
عمدہ کہا ہے

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق

اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت ۔۔۔''

اُوپر کی سطور میں جو اقتباس میں نے درج کیا ہے اس کے کلائمکس تک قارئین کرام کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے میں ایک ایسا واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں جو ابھی تک وضاحت کے ساتھ منظرِ عام پر نہیں آیا۔

۱۹۹۲ء میں قتیل شفائی کا جشن منعقد ہوا اور اس جشن کی صدارت کا قرعہِ فال راقم التحریر کے نام پڑا۔ سلیم جعفری صاحب کے طے کئے ہوئے ضابطے کے مطابق دُوسرے برس یعنی ۱۹۹۳ء میں اِس خاکسار کا جشن منعقد ہونا تھا لیکن جشن سے چار ماہ قبل ایودھیا میں بابری مسجد کی شہادت کا حادثہ رُونما ہوگیا۔ اس حادثے کی خبر رُوئے زمین پر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ یونی کیئرز انٹرنیشنل کراچی اور یونی کیئرز انٹرنیشنل یو۔اے۔ای چیپٹر بھی اس جانکاہ واقعہ سے بے خبر نہ رہے۔ اس بات کی اطلاع کہ اگلے برس متحدہ عرب امارات میں جگن ناتھ آزاد کا جشن منایا جائے گا' اس سے پہلے مشتہر ہو چکی تھی۔ اس سال قتیل شفائی کے جشن کا جگن ناتھ آزاد کی صدارت میں منعقد ہونا اپنی جگہ اس بات کا اعلان تھا کہ اگلے برس جگن ناتھ آزاد کا جشن منعقد ہوگا اور جشن قتیل کے مشاعرے میں یہ اعلان ہو بھی گیا۔ بعض اخبارات میں غالباً یہ خبر بھی شائع ہوگئی کہ جگن ناتھ آزاد کے جشن کی صدارت محشر بدایونی کریں گے۔

اب بابری مسجد کی شہادت کا حادثہ مسلمانوں کے لیے اور دُنیا بھر کے شریف اِنسانوں کے لیے ایک اندوہناک حادثہ تھا۔ یونی کیئرز انٹرنیشنل کے بعض اراکین اس بات پر اڑ گئے کہ جشن آزاد ایک طرف رہا' یونی کیئرز انٹرنیشنل کے مشاعرے میں کسی ہندوستانی شاعر کو بالخصوص کسی ہندو شاعر کو مدعو تک نہیں کیا جائے گا۔ متحدہ عرب امارات کے بعض حضرات بھی جن کا تعاون سلیم جعفری صاحب کو روزِ اول سے حاصل تھا جگن ناتھ آزاد کے جشن پر معترض تھے۔

اس اطلاع سے سلیم جعفری صاحب پر جو میرے جشن کے انتظامات خاصی حد تک مکمل کر

چکے تھے، کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ آسان نہیں۔ حاجی انیس دہلوی صاحب سووینیر کے لیے بڑی تعداد میں مضامین منگوا چکے تھے ان کا انتخاب ہو رہا تھا۔ بعض کی کتابت جاری تھی' بعض کی طباعت ہو چکی تھی۔ تصاویر بھی چھپ چکی تھیں۔ اس دوران میں مختلف امور کے بارے میں سلیم جعفری صاحب اور میرے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ کسی خط میں وہ بعض مضامین کا ذکر کرتے تھے' کسی خط میں تصویر کا' کسی میں مضمون نگار کا لیکن کسی بھی خط میں اُنھوں نے اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ بابری مسجد کی شہادت کے بعد میرے جشن کے بارے میں ایک خاصی تعداد میں مسلمانوں کے تاثرات کیا ہیں اگر چہ اُڑتی چڑیا کی زبانی میں کسی حد تک اس اطلاع سے آگاہ ہو چکا تھا لیکن میرے لئے خاموش رہنے کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔

دہلی تو مہینے میں ایک بار آنا ہی ہوتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں دہلی کی ایک محفلِ احباب میں پہنچا تو میرے وہاں پہنچتے ہی ایک دوست نے کہا آزاد' سنا ہے آپ کا جشن منسوخ ہوگیا ہے۔ میں نے یہ کہہ کے لاعلمی کا اظہار کیا کہ مجھے اس امر کی کوئی اطلاع نہیں۔ لیکن رازِ درونِ پردہ یہی تھا کہ جشن کے منسوخ ہونے کی نوبت آگئی تھی۔ آخر تاریخِ جشن آگئی اور جشن میں شرکت کے لیے جب میں دبئی پہنچا اور سلیم جعفری صاحب نے دورانِ گفتگو میں تمام واقعات سے پردہ ہٹایا تو میں غرقِ حیرت ہوگیا۔ کس طرح سلیم جعفری صاحب نے کراچی اور دبئی اور العین وغیرہ میں مخالفینِ جشن کو حامیانِ جشنِ آزاد میں تبدیل کیا' کس طرح اُنھیں اس بات کا قائل کیا کہ ایودھیا میں مسجد اگر شہید ہوئی ہے تو اس واقعے سے آزاد کا کیا تعلق' وہ تو سیاسی آدمی ہی نہیں ہے بلکہ اس نے تو مسجد کو شہید کرنے والوں کے خلاف لکھا ہے۔ اور اس موضوع پر اس کی نظم ہندوستان اور پاکستان کے رسائل اور اخبارات کے علاوہ روزنامہ ''جنگ'' (لندن) تک میں شائع ہوئی ہے۔ یہ ساری داستان حیرت کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے یہ داستان اول سے آخر تک سنی تو علامہ اقبال کا یہ شعر میری زبان پر آیا

یقینِ محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ہندو مسلم اتحاد، ہند پاکستان دوستی اور اُردو زبان و ادب کی خدمت کا دعویٰ کرنے والوں کی تعداد گنتی سے باہر ہے لیکن اِمتحان کے وقت ثابت قدم رہنے والوں کی تعداد شاید اُنگلیوں پر گِنی جاسکتی ہے اور اُنگلیوں پر گِنی جانے والی شخصیتوں میں ایک نمایاں شخصیت سلیم جعفری کی ہے جو صرف اُردو زبان و ادب کی خدمت کا ہی علمبردار نہیں ہے بلکہ اُردو تہذیب کی خدمت کا بھی علمبردار ہے۔ خدا اُردو تہذیب کے اس عاشقِ صادق کو ہمیشہ اپنی امان و حفاظت میں رکھے تا کہ اُردو کا قافلہ اسی طرح رواں دواں رہے اور ایک روز یہ تہذیب ہندوستان اور پاکستان کو دو سچے دوستوں کی صورت میں دُنیا کے سامنے پیش کر سکے۔

☆ مسجد کی شہادت کے دُوسرے روز ۷ر دسمبر کو حکومتِ ہند نے اُردو یونی ورسٹی کی میٹنگ رکھی تھی۔ آزاد ۶ر کی شام کو دہلی پہنچے تو انھیں مسجد کے مسمار ہونے کی اطلاع ملی۔ دُوسری صبح جب وہ منسٹری آف ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ کے کانفرنس ہال میں پہنچے تو وہاں عزیز قریشی صاحب، سیّد حامد صاحب، جمال قدوائی صاحب، شیخ صاحب، مالک رام صاحب اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ موجود تھے۔ آزاد صاحب نے کمیٹی کے دُوسرے ارکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مالک رام صاحب سے کہا "مالک رام صاحب، میں اور آپ تو اب ان دوستوں کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے۔" آزاد کا یہ جملہ سیّد حامد صاحب کے حوالے سے متعدد اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔

(انیس دہلوی)

آپا حمیدہ سُلطان اور میں

(یادوں کا ایک ورق)

محترمہ حمیدہ سلطان احمد میری بہن ہیں اور بھائی اگر بہن کے بارے میں کچھ لکھے تو بعض قاری یہ خیال کر سکتے ہیں کہ بھائی نے تعریف میں مُبالغے سے کام لیا ہوگا۔ لیکن میں سطورِ ذیل میں جو کچھ لکھ رہا ہوں اُس کا مُبالغہ آرائی سے دُور دُور تک کا بھی تعلق نہیں ہے۔

مجھے ۱۹۴۷ء کا زمانہ ابھی تک یاد ہے جب لاہور اور راولپنڈی سے لُٹ پِٹ کے ہم لوگ دہلی پہنچے تھے اور اُس وقت اپنے لُٹنے پِٹنے کا اِتنا غم نہیں تھا جتنا اِس بات کا کہ ہندوستان میں اُردو اَب چند روز کی مہمان رہ گئی ہے۔ خُدا کا شکر ہے کہ مرورِ ایّام کے ساتھ میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور آج بقول ڈاکٹر خلیق انجم اُردو کی (میلوں تک) پھیلی ہوئی زمین ہم انچوں کے حساب سے (سہی) واپس لے رہے ہیں (بلکہ خاصی حد تک واپس لے بھی چکے ہیں)۔

اَب میں عُمر کی اُس منزل میں ہوں جب اکثر و بیشتر اِنسان کا حافظہ اُس کا ساتھ نہیں دیتا۔ مَیں اَب یہ لکھنا چاہتا تھا کہ آپا حمیدہ سلطان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۷ء میں اُن کے مکان علی منزل ہی میں ہوئی۔ سوچا اِسے چیک کرلوں۔ چنانچہ آپا حمیدہ سلطان کی کتاب ''جگن ناتھ آزاد اور اُس کی شاعری'' نکالی تو اُس کے دیباچے میں یہ عبارت نظر آئی۔

''کیفی آنجہانی کا وجودِ بابرکت اس لا محدود اندھیرے میں منارۂ نور کی مانند تھا۔ اگلے وقتوں کے آدمی اور اُس دِلّی کے شیدا تھے جہاں ہندو مسلمانوں نے مل کر اُردو کو کنگھی چوٹی سے سنوارا۔ اُن کو اِس انقلاب پر حیرت بھی تھی اور افسوس بھی۔ اُنھوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ دہلی کے بعض اُردو اَدب دوستوں کی اِمداد بھی شاملِ حال ہوئی۔ اور اُردو مجلس' ہارڈنگ لائبریری میں باقاعدہ جم گئی۔ اِس کی نشستوں میں دِلّی کے ادیبوں شاعروں سے زیادہ پنجاب والے آتے تھے۔ غالباً نومبر ۱۹۴۹ء کا مہینہ تھا۔ اُس دِن انجمن کے اراکین میں میرے اور علامہ مرحوم کے علاوہ اور کوئی کافی وقت گزر جانے پر بھی نہیں پہنچا تھا۔ علامہ سرنگوں بیٹھے غالباً اُس ادبی چہل پہل کے زمانے کو یاد کر رہے تھے جب دِلّی کے ہر دیوان خانے میں شعر واَدب کے تذکرے رہتے تھے۔ اور میں سوچ کر گھبرا رہی تھی کہ شاید آج کوئی بھی نہیں آئے گا۔ قدموں کی آہٹ ہوئی۔ میں نے نظر اُٹھائی۔ ایک کھلتے ہوئے سانولے رنگ کا نوجوان جس کے خط وخال سے ذہانت ٹپک رہی تھی' مبہم سی مسکراہٹ لبوں پر لئے کالی شیروانی زیب تن کئے کالے رنگ کا چشمہ لگائے سامنے کھڑا

تھا۔ اُس نوجوان نے پہلے علامہ کیفی کے سامنے جھک کر اَدب سے سلام کیا اور پھر مجھے۔ کیفی صاحب نے مُسکرا کر کہا۔ ''آؤ آزاد! آؤ، شکر ہے یہاں کا سکوت تو اب ٹوٹا۔ ہاں بھئی سناؤ کوئی اپنی تازہ چیز اور آزاد نے بہت خوب کہہ کہ دوزانو بیٹھ کر سنانا شروع کیا۔

ع۔ نہ پُوچھو جب بہار آئی تو دِیوانوں پہ کیا گزری'

آزاد کا دِلکش شعر میں ڈوبا ہوا ترنّم مجھے بہت اچھا لگا ———— ''

اِس تحریر نے مُجھے یاد دِلایا کہ انجمن ترقی اُردو (ہند) کی دہلی شاخ کہیں بعد میں قائم ہوئی اور وہ بھی آپا حمیدہ سلطان ہی کی کوششوں سے۔ پہلے تو اُنھوںؒ نے اپنی کوشش سے اور علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی کے ساتھ مشورہ کر کے ہارڈنگ لائبریری میں اُردو مجلس کی بنیاد ڈالی۔

مندرجہ بالا اقتباس پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اُس زمانے کی اکثر باتیں مجھے یاد آگئیں یعنی یہ کہ انجمن ترقی اُردو (ہند) کا صدر دفتر جو ڈاکٹر انصاری مرحوم کی محل نما کوٹھی میں تھا وہ تو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں ہی میں برباد ہوگیا تھا۔ اور مولانا آزاد مرحوم کے مشورے سے صدر دفتر علی گڑھ منتقل ہوگیا تھا جس کا سیکرٹری اُنھوں نے قاضی محمد عبدالغفار کو مقرر کیا تھا کیونکہ مولوی عبدالحق اُس وقت تک پاکستان جاچکے تھے۔

اُس زمانے میں حمیدہ سلطان احمد اپنے دُوسرے افرادِ خاندان کے ساتھ شیلانگ گرمیاں گذارنے گئی ہوئی تھیں۔ خداوند کریم کا شکر ہے کہ وہ اُس وقت دہلی میں نہیں تھیں اور بالخصوص اپنے جدّی مکان میں' کیونکہ اُن کا گھر تو لُٹا۔ خدا جانے، اگر یہ لوگ گھر میں ہوتے تو اِن کا کیا حشر ہوتا۔ جب وہ واپس آئیں تو گُلشنِ اُردو کی بہار خزاں میں تبدیل ہوچکی تھی۔ اِس خزاں کو بہار میں تبدیل کرنے کی کوشش اُنھوں نے اُسی وقت سے شروع کردی۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۹۹ء تک پوری

نصف صدی کا فاصلہ ہے۔ اِس نصف صدی میں اُنھوں نے انجمن ترقی اُردو (ہند) کی دہلی شاخ کو باقاعدگی کے ساتھ جاری رکھا ہے۔ اس کے ماہانہ پروگرام بھی جاری رہے ہیں اور سالانہ پروگرام بھی، جن میں ہر سال یومِ غالب کا انعقاد خاص اہمیت کا حامل ہے۔

اس تنظیمی کام کے ساتھ ہی ساتھ حمیدہ سلطان احمد تخلیقی کام سے بھی غافل نہیں رہی ہیں۔ میں اپنے حافظے کی بات پہلے کر چکا ہوں کہ یاداشت اِن دنوں میں پوری طرح سے ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ اُن کی تصانیف میری نظر سے گزری ہیں۔ غالبؔ پر اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے میں نے پڑھا ہے اور اس سے مستفید ہوا ہوں۔ اُن کا ناول میں نے پڑھا ہے لیکن یہاں میں اُن کے ادبی کمالات یا تخلیقی کاموں کا ذکر نہیں کروں گا کیونکہ شاید ماہلی صاحب نے یہ شرط عائد کی ہے کہ تحریر تین صفحات سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ میں نے چونکہ اُن کی شخصیت پر لکھنا شروع کیا ہے اس لیے اس موضوع ہی پر اپنے اِس مضمون کو ختم کرنا چاہوں گا اور ایک بار پھر اُن کے مذکورہ دیباچے ہی کی طرف رجوع کروں گا:

''میں فطری طور پر رکھ رکھاؤ کی ایسی عادی ہوں کہ اکثر لوگوں سے بہت دِنوں تک ملتے رہنے کے بعد بھی کُھل کر بات نہیں کرتی اور بہت لیے دیے رہتی ہوں۔ لیکن چند اُردو ادیب ایسے بھی ہیں جو کچھ ملاقاتوں کے بعد ہی میرے بے تکلف دوست بن جاتے ہیں۔ میری پسندیدہ ادبی شخصیتوں میں آزاد کا شمار بھی ہے۔ ۱۹۵۱ء سے تو آزاد انجمن ترقی اُردو کی شاخ دہلی کی انتظامیہ کمیٹی کے ایک رُکن ہونے کی حیثیت سے میرے ادبی کاموں میں ایک ساتھی ہیں۔

ملنے کے چند مہینے بعد ہی آزاد نے مجھے آپا جان کہنا شروع کر دیا تھا اور میں بھی چھوٹے بھائیوں کی طرح آزاد کو

چاہتی ہوں۔

''والدہ صاحبہ مرحومہ کے تو آزاد بہت ہی چہیتے تھے۔ وہ اُن سے اکثر شعر سُنتیں اور خوش ہوتیں۔ آزاد کبھی کبھی مشاعروں کے چکر میں پھنس کر بہت دِنوں تک نظر نہ آتے تو مرحومہ ناراض ہو کر فرماتیں۔ ''اے نوج آج کل کے مشاعرے بھی موئے جان کا عذاب ہو گئے ہیں۔ خدا جانے یہ آزاد کہاں مارا مارا پھر رہا ہے کہ مہینوں سے شکل بھی نہیں دکھائی'' اور جب آزاد کو اس خفگی کی خبر ملتی وہ فرصت پاتے ہی ایک محبوب مسکراہٹ لبوں پر لئے ہمہ تن انفعال بنے موجود ہو جاتے اور ان کی صورت دیکھتے ہی فرمائشوں کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی۔ والدہ صاحبہ فرماتیں ''ہاں سلام سناؤ''۔ آزاد مؤدبانہ انداز سے سلام پڑھتے۔ میں کہتی'' بھئی میں تو وہ پٹنے کے مشاعرے والی غزل سُننا چاہتی ہوں'' اور نجمہ فرمائش کرتیں ''ہمیں تو آپ کی وہ چیز بہت پسند ہے۔

تیری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں
چمن میں یادِ ایامِ بہاراں لے کے آیا ہوں

شریر اختر بھولا منہ بنا کر کہتی'' چھوٹی بہن کی بھی تو سُن لیجیے! بھائی مجھے تو وہ غزل بالکل حقیقت معلوم ہوتی ہے

ع- اے دل اُلجھ گیا ہے مذاقِ نظر کہاں

بس میں تو وہی سنوں گی اور ورنہ بھابی کے کان آپ کے خلاف بھروں گی۔ آزاد مُسکرا کر کہتے'' اچھا' بہت اچھا'' اور دلنشیں انداز

میں سب کی فرمائش پوری کر دیتے۔"

۱۹۶۸ء میں میرا تبادلہ سری نگر ہو گیا۔ اور نتیجتاً آپس کی ملاقاتوں کا سلسلہ پہلے کی طرح جاری نہ رہ سکا۔ اس کے باوجود ملاقات کی صورت پیدا ہوتی رہی۔ ایک بار سری نگر جاتے ہوئے آپا نے ہمارے یہاں جموں میں قیام کیا اور ایک بار پٹنے کے راج بھون میں اُن سے ملاقات ہوئی جب کہ وہ قریشی صاحب گورنر بہار کے یہاں مقیم تھیں۔ اسی طرح دہلی میں کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی ہے۔ لیکن گزرا ہوا وقت واپس نہیں آتا۔ میں آپا حمیدہ سلطان کی علمی، ادبی اور خدمتِ اُردو کی رُوداد اخبارات میں پڑھتا رہتا ہوں اور خداوند کریم سے یہ دُعا کرتا رہتا ہوں کہ محترمہ حمیدہ سلطان کا سایہ تادیر اُردو زبان اور ادب پر قائم رہے اور اُردو دُنیا اُن کے کام سے فیض یاب ہوتی رہے۔

ع۔ ایں دُعا از من واز جملہ جہاں آمین باد!

اس کے ساتھ ہی ساتھ میں غالب اِنسٹی ٹیوٹ کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں اور مبارک باد دیتا ہوں کہ برِ صغیر کا یہ مایہ ناز اِنسٹی ٹیوٹ اُردو کی ایک قابلِ فخر مصنفہ اور انجمن ترقی اُردو (ہند) شاخ دہلی کی جنرل سیکرٹری کے اعزاز میں ایک کتاب شائع کر رہا ہے۔

مُظفّر حسین برنی

جب تک میں دہلی میں رہا' ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۸ء تک' برنی صاحب کے ساتھ میری ملاقاتیں علیک سلیک کی حد سے آگے نہ بڑھیں۔ مشاعروں اور ادبی نشستوں کی ملاقاتیں بھی اسی حد کے اندر رہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے دہلی میں ایک نعتیہ مشاعرہ تھا۔ میں نے اپنا نعتیہ کلام پڑھا۔

سلام اُس ذاتِ اقدسؐ پر سلام اُس فخرِ دوراںؐ پر

سننے والوں میں برنی صاحب بھی موجود تھے۔ انھیں یہ نعت بہت پسند آئی لیکن اس بات کا علم مجھے بہت بعد میں ہوا۔ کئی برس بعد جب برنی صاحب سے بھُبنیشور میں ملاقات ہوئی جہاں وہ حکومتِ اُڑیسہ کے چیف سیکرٹری تھے۔ وہاں ایک شعری نشست میں برنی صاحب کی زیرِ صدارت جب میں کلام پڑھنے لگا تو اُنھوں نے دہلی کا نعتیہ مشاعرہ یاد دِلایا اور اس نعت کی فرمائش کی اور اس سے پہلے کہ میں یہ نعت شروع کرتا برنی صاحب نے سامعین کو اس نعت کا ذکر کرتے ہوئے اس

مشاعرے کی رُوداد سنائی اور نعت کا ذکر اس تعریفی انداز میں کیا کہ میں صرف حیرت زدہ ہی نہیں رہ گیا بلکہ اپنی ہیچ مدانی بھی مجھ پر آئینے کی طرح روشن ہوگئی کیونکہ رسولِ اکرمؐ کی شان میں اُردو اور فارسی کے بڑے بڑے شعراء مثلاً جامی، نظامی، گرامی، غالب، اِقبال، درگا سہائے سرور، مُحروم، محسن کاکوروی وغیرہم اتنی بلند مرتبہ نعتیں کہہ چکے ہیں کہ میری نعت ایک جذبہء عقیدت کا اِظہار تو کہی جاسکتی ہے لیکن مذکورہ نعتوں کے سامنے میری نعت غالباً ادبی مرتبے کے اعتبار سے قابلِ ذکر اہمیت نہیں رکھتی ہوگی۔ اس وقت برنی صاحب کے ساتھ میں نے ایک دلی قرب محسوس کیا اور مُجھے خوشی ہوئی کہ برنی صاحب میری شاعری کے قدردانوں میں ہیں۔

لیکن بھُب نیشور کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے میں بہت دُور نکل گیا ہوں۔ کیونکہ یہ ملاقات غالباً ۱۹۷۵ء کے لگ بھگ کی ہے جب ساہتیہ اکیڈمی کے ایک رُکن کے طور پر میں اکیڈمی کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لئے بھُب نیشور گیا۔ مجھے یہاں ایک اور ملاقات کا ذکر اس سے بہت پہلے کرنا چاہئے تھا اور وہ ملاقات جو شاید برنی صاحب کو یاد نہ ہو ۱۹۷۳ء کی ہے۔

میں نے یونیورسٹی آف کشمیر کی فرمائش پر منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کی زیرِ ہدایت اِقبال نمائش مرتب کی۔ اُس وقت اندر کمار گجرال وزیر اطلاعات ونشریات تھے اور انور جمال قدوائی اُس وزارت کے سیکرٹری تھے۔ یہ نمائش علامہ اِقبال کی تصویروں اوران کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریروں کے فوٹوگرافوں پر مشتمل تھی جن کی مجموعی تعداد چھے سو سے زیادہ تھی اب اس وقت مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آرہا ہے لیکن شاید صحیح تعداد ۶۳۷ یا ۶۴۷ تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ان تصاویر کے blow-up تیار کرانے سے پہلے گجرال صاحب یا قدوائی صاحب ان تمام تصاویر اور ان کے عنوانات کو دیکھ لیں کیونکہ اِقبال اور اِقبالیات اُس وقت ہندوستان میں ایک متنازعہ فیہ حیثیت رکھتے تھے اور یہ نمائش حکومتِ ہند کی طرف سے منعقد کی جارہی تھی۔ اِقبال اور اِقبالیات کی مُتنازعہ فیہ حیثیت تو آج بھی ہندوستان میں کسی نہ کسی طرح باقی ہے لیکن اُس وقت یہ Controversy بنیادی طور پر سیاسی نوعیت کی تھی۔ آج سیاسی نوعیت کی Controversy والا گراف

بہت نیچے جاچکا ہے اور دوسرے متنازعہ فیہ امور جن کی حیثیت خالص علمی اور ادبی ہے اُبھر کر اُوپر آچکے ہیں اور ایک بڑے شاعر کے متعلق اس قسم کا اختلافِ رائے تو ہمیشہ رہتا ہی ہے۔ مثلاً ہندوستان میں آج اِقبال کی شاعری اور خطابت کا مسئلہ یا علامتی اور براہِ راست شاعری کا مسئلہ اُن کی سیاسیات کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کا حامل بن چکا ہے۔ چونکہ مذکورہ نمائش اوّل سے آخر تک راقم التحریر ہی کی کوشش اور کاوش کا نتیجہ تھی اور اگر اس نمائش کے سلسلے میں کوئی سیاسی پارٹی حکومتِ ہند پر اعتراض کرتی تو انجام کار میں ہی اس اعتراض کی زد میں آجاتا اور اس وقت یہ تو کوئی نہ دیکھتا کہ جگن ناتھ آزاد ایک شاعر بھی ہے اور اِقبال پر بھی کام کر رہا ہے، وہ ایک گورنمنٹ آفیشل کے طور پر زیرِ عتاب آجاتا۔ اس لئے میں پھونک پھونک کے قدم رکھنا چاہتا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ گجرال صاحب یا قدوائی صاحب ایک بار اس نمائش کو چھے سو blow-up تیار ہونے سے قبل editing room میں آکر دیکھ لیں جہاں میں نے یہ تمام تصویریں چھوٹے سائز میں تیار کرا کے دیواروں پر لگا رکھی تھیں۔ دراصل اس وقت میرا مطمحِ نظر اِقبال کا یہ شعر نہیں تھا ؎

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

بلکہ اپنے دوست ظہیر کاشمیری کا یہ شعر تھا ؎

کبھی ہوا کا کبھی اپنا رُخ بدل کے چلو
یہ دورِ برق وشرر ہے سنبھل سنبھل کے چلو

اِقبال کے متعلق ملک کی فضا آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس چلتے ہوئے کام میں رخنہ پیدا ہو۔ اس سے قبل میں روزنامہ ''پرتاپ'' اور روزنامہ ''Mother land'' کے عتاب کی زد میں آچکا تھا لیکن یہ اخبارات جن سنگھ سے وابستہ تھے۔ حکومت کے عتاب کی زد میں آنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ حکومت کی پوزیشن پر بھی حرف آتا، کانگریس پر بھی اور اِقبالیات کے تعلق سے جو فضا بہتر ہوتی جارہی تھی اس پر بھی ناخوشگوار اثر پڑتا۔ اس لئے میں اس بات پر مصر تھا

کہ متعلقہ وزیر یا متعلقہ سیکرٹری صاحب اس نمائش کو انعقاد سے قبل اپنی مکمل صورت میں ایک بار دیکھ لیں۔

گجرال صاحب اور قدوائی صاحب کئی روز تک مصروفیات کی بنا پر ایڈیٹنگ رُوم میں نہ آسکے اور جب اُنھیں معلوم ہوا کہ آزاد نے اس کام کو کسی موہوم یا حقیقی خدشے کی بنا پر روک رکھا ہے تو قدوائی صاحب نے وقت نکالا اور وہ ڈی۔اے۔وی۔پی کے ایڈیٹنگ رُوم میں تشریف لائے۔ اُن کے ساتھ مظفر حسین صاحب برنی بھی تھے، قرۃ العین حیدر بھی اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو عینی کی ہمشیرہ بھی۔ اس وقت ہم سب نے اُن تمام تصاویر اور اُن کے عنوانات پر جو راقم التحریر نے لکھے تھے نظر ڈالی۔ ایک تصویر کا عنوان یہ تھا۔

"علامہ اقبال آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (۱۹۳۰ء)
میں خطبہء صدارت پڑھتے ہوئے جس میں اُنھوں نے تصور
پاکستان پیش کیا۔"

مجھے یہ عنوان صحیح ہونے کے باوجود مناسب معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ قدوائی صاحب نے مشورہ دیا کہ عنوان میں سے یہ حصّہ نکال دیا جائے۔

"جس میں اُنھوں نے تصوّرِ پاکستان پیش کیا۔"

چنانچہ یہ حصّہ نکال دیا گیا۔

اس وقت میں نے دیکھا کہ برنی صاحب ایک ایک تصویر کو پوری توجہ سے دیکھ رہے ہیں اور عنوانات کا ایک ایک لفظ نہایت غور سے پڑھ رہے ہیں۔ اُنھوں نے اس موقعے پر راقم التحریر کو انتہائی گراں قدر مشورے دیے جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ اُردو کے ساتھ یہ عنوانات انگریزی میں بھی دیے جائیں اور جس جس ریاست میں یہ نمائش منعقد کی جائے اس کی زبان میں یہ عنوانات دیے جائیں۔ چنانچہ جب یہ نمائش تمل ناڈو میں منعقد کی گئی تو تصاویر پر عنوانات تمل میں بھی دیے گئے۔ اسی طرح مہاراشٹر میں جب اس کا انعقاد

ہوا تو عنوانات مراٹھی میں بھی دیے گئے۔ پنجاب میں عنوانات پنجابی میں بھی اُردو اور انگریزی کے ساتھ موجود تھے اور اُتر پردیش میں ہندی بھی اُردو اور انگریزی کے ساتھ شریک تھی۔

دراصل برنی صاحب کے ساتھ صحیح معنوں میں میری یہ پہلی ملاقات تھی اور میں نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ تو میرا اقبال والا رشتہ بھی موجود ہے لیکن چونکہ اس وقت تک اقبال کے متعلق اُن کی کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گزری تھی (اور یہ میری کوتاہی ہو سکتی ہے) اس لئے میں ان کی اس "اقبال مندی" سے بے خبر تھا۔

وقت گزرتا گیا اور جمال قدوائی صاحب کے وزارتِ اطلاعات ونشریات سے سبک دوش ہونے کے بعد برنی صاحب اُن کے جانشین مقرر ہوئے۔ گویا اب برنی صاحب اسی وزارت کے معتمدِ اعلیٰ تھے جس میں مَیں ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کے طور پر کام کر رہا تھا۔ میں ابھی تک سری نگر ہی میں تھا۔ برنی صاحب حکومتِ ہند کے سیکرٹری تھے اس لئے دہلی میں تھے۔ اب یہ افسر اور ماتحت کا رشتہ تھا اور اس میں اقبال والا رشتہ جس کا مجھے ایک بار خیال آیا تھا دب کے رہ گیا بلکہ پیدا ہی نہ ہو سکا۔ ہاں اُس زمانے میں اقبال نمائش پر برنی صاحب کا ایک مضمون میری نظر سے گزرا جس میں اُنھوں نے میرے کام کی بڑی تعریف کی تھی۔ مجھے یہ مضمون پڑھ کے دوگونہ مسرّت ہوئی کیونکہ یہ مضمون ایک تو ملک کے ایک اقبال شناس کی تحریر تھی دُوسرا میرے لئے حکومت کی طرف سے ایک سرٹیفکیٹ تھا کہ اقبال نمائش کی ترتیب وتدوین ایک صحیح نوعیت کا کام ہے اور اس کام کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

یہ مضمون میرے کاغذات میں موجود ہے لیکن اس وقت سامنے نہیں ہے ورنہ میں اس سے دو ایک اقتباسات نقل کر کے اُس دور کی یاد تازہ کرتا اور اپنے لیے تعریف وتوصیف کا سامان بھی پیدا کرتا جو ایک عام انسانی فطرت ہے۔

برنی صاحب کی سیکرٹری شپ کے زمانے ہی میں میری میعادِ ملازمت میں توسیع ہو گئی۔ دسمبر ۱۹۷۶ء میں مجھے ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کے عہدے سے سبک دوش ہونا تھا۔ یہ ایمرجنسی کا

زمانہ تھا۔ ملازمت میں توسیع ایک برس کے لئے ہوئی تھی۔ یہ اپنی جگہ ایک الگ داستان ہے جو خاصی دلچسپ ہے لیکن اس کے سنانے کا یہاں محل نہیں ہے۔

اِس وقت تک قدوائی صاحب جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں چیئر مین جموں وکشمیر پبلک سروس کمیشن کے طور پر سرینگر آ چکے تھے۔ اُن کے ساتھ اکثر ملاقات رہتی تھی۔ وہ بھی کبھی کبھار شام کو دفتر سے فارغ ہو کر پریس انفارمیشن بیورو آ جایا کرتے تھے اور ہم اکھٹے بلیورڈ کی سیر کو نکل جاتے تھے۔

ایک دن اسی سیر کے دوران میں قدوائی صاحب نے مُجھ سے یہ کہا کہ ملازمت میں ایک برس کی توسیع تو تمہیں مل گئی ہے اب اس کے بعد کیا پروگرام ہے۔ میں نے کہا جمال بھائی، کوئی پروگرام نہیں ہے۔ میں ریٹائر ہو کے بیکار ہو جاؤں گا۔ بچوں کی شادیوں کا مرحلہ بھی ابھی باقی ہے۔ یہ صورتِ حال کسی حد تک پریشان کن تو ہے۔ اس لئے تو میں گذشتہ دو چار برس آپ سے اور گجرال صاحب سے یہی کہتا رہا ہوں کہ مجھے واپس دہلی بلا لیجئے۔ میں دہلی میں ریٹائر ہوں گا' پریس انفارمیشن بیورو سے' تو کسی نہ کسی اچھے اخبار کی نمائندگی مُجھے مل جائے گی۔ اب یہاں رہ کر غیر ملکی ایڈیٹروں اور صحافیوں سے وہ مراسم پیدا نہیں ہو سکے جو دہلی میں ہو گئے تھے یا اب پھر دو ایک برس میں پیدا ہو سکتے تھے۔ سری نگر سے ریٹائر ہوں گا تو ایک مسئلہ تو پیدا ہو جائے گا۔

دو چار روز کے بعد جمال صاحب سے جب پھر ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے مُجھ سے پوچھا کہ اگر تمہیں جموں یونی ورسٹی سے شعبۂ اُردو کی پروفیسر شپ اور صدارت کی پیش کش ہو تو تمہارا کیا ردِ عمل ہوگا۔ مُجھے اِس بات پر حیرت ہوئی کہ نہ میں ڈی لٹ، نہ پی ایچ ڈی، نہ میں اُردو میں ایم اے' تو یہ بیل کیسے منڈھے چڑھے گی۔ لیکن آخر کار ہوا وہی جس کا ذکر قدوائی صاحب نے کیا تھا۔ دراصل اس سارے منصوبے کی داغ بیل قدوائی صاحب ہی نے ڈالی تھی۔ اور اُنھی کی بدولت یہ معاملہ طے ہوا تھا۔ چنانچہ مجھے جموں یونیورسٹی کی طرف سے پروفیسر اور صدرِ شعبہ اُردو

کے عہدے کی پیش کش ہوگئی لیکن جب کبھی میں نے اُن کا شکریہ ادا کرنے کے لئے زبان کھولنا چاہی تو اُنھوں نے مُجھے روک دیا اور اگر کسی سے میں نے یہ کہا کہ یہ سب قدوائی صاحب کی عنایت سے ہوا ہے تو اُنھوں نے اس کا بُرا مانا۔

اُس وقت تک مُلک میں ایمرجنسی ختم ہو چکی تھی۔ اِندرا جی کی جگہ مرارجی ڈیسائی وزیرِ اعظم بن کے آ چکے تھے۔ میرے لئے یہ سارا معاملہ نیا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۶ء تک کانگریس کی حکومت کے دور میں زندگی بسر ہوئی تھی۔ ملاقاتیں' واقفیتیں' تمام اسی حکومت کے لوگوں سے رہی تھیں۔ ایک دن کی بات تو تھی نہیں' تیس برس کی ملاقاتیں تھیں' بلکہ دراصل یہی لوگ پہلے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں شامل تھے۔ اکثر کے ساتھ ملاقاتیں اُس وقت سے چل رہی تھیں۔ اب ایک نئے ماحول کا سامنا تھا۔ میں سری نگر میں حکومتِ ہند کی طرف سے ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز تھا اور مرکز کی ساری کیبنٹ میں نہ میں کسی وزیر کو جانتا تھا نہ کوئی وزیر میرے نام یا کام سے واقف تھا۔ حکومت کی جانب سے ملازمت میں ایک برس کی جو توسیع ہوئی تھی اس کے ختم ہونے میں ابھی چھے ماہ باقی تھے۔ استعفیٰ دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لیکن استعفیٰ کیسے منظور ہوگا یہ مسئلہ پریشان کر رہا تھا۔ میں دہلی برنی صاحب کے پاس پہنچا، اُن سے ساری صورتِ حال بیان کی۔ وہ اِس اطلاع سے بہت خوش ہوئے کہ مجھے جموں یونی ورسٹی کی طرف سے پروفیسر اور صدرِ شعبۂ اُردو کے عہدے کی پیش کش ہوئی ہے۔ لیکن اُن کے ساتھ بات چیت سے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ نئی صورتِ حال سے وہ بھی کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہیں۔ اُنھوں نے مجھے متعلقہ وزیر شری ایل کے ایڈوانی سے ملنے کا مشورہ دیا۔ میں اُن سے ملا۔ اُنھوں نے جموں وکشمیر کے متعلق بات چیت شروع کی اور بیس پچیس منٹ کی بات چیت کے بعد فرمایا کہ میرے خیال میں آپ کا موجودہ عہدے پر سری نگر میں رہنا ضروری ہے۔

میری تو تمام اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ واپس پلٹ کر میں پھر برنی صاحب کی خدمت

میں حاضر ہوا اور ساری بات اُنھیں کہہ سُنائی۔ اُنھوں نے کہا یہ تو

ع - اے روشنیِ طبع تو بر من بلا شدی

والا معاملہ ہو گیا۔

دراصل اپنا استعفیٰ تو مجھے پرنسپل انفارمیشن آفیسر کو پیش کرنا تھا۔ وہ اسے برنی صاحب کو بھیجتے اور برنی صاحب کی سفارش سے یہ متعلقہ وزیر کو جاتا۔ لیکن اب معاملہ قدرے بگڑ چکا تھا۔ برنی صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ تم اپنا استعفیٰ تو پیش کر ہی دو۔ کل تک میرے پاس آجائے گا۔ اُمید ہے مسئلہ سُلجھ جائے گا۔

چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ غالباً اُسی روز یا دُوسرے روز برنی صاحب نے وزیرِ متعلقہ سے بات کی اور میرا استعفیٰ منظور ہو گیا۔

لیکن کوئی پانچ سات روز بعد وزیرِ اعظم مرارجی ڈیسائی سرینگر آ رہے تھے۔ اُن کی پریس کانفرنس کا انتظام مجھے کرنا تھا۔ اِدھر جموں یونی ورسٹی کے وائس چانسلر صاحب مصر تھے کہ میں جلد از جلد جموں پہنچ کے اپنا چارج سنبھال لوں۔ گویا مجنوں کی جان دوگونہ عذاب میں تھی۔ میں نے اِس اندازے کے پیشِ نظر کہ فلاں تاریخ کو وزیرِ اعظم کی پریس کانفرنس ہوگی اس کے دو دن کے بعد کی تاریخ یہ کہہ کر وائس چانسلر صاحب کو دے دی کہ اس تاریخ پر حاضر ہو جاؤں گا۔

اب اتفاق دیکھئے کہ وزیرِ اعظم کا پروگرام قدرے تبدیل ہو گیا اور اُسی روز پریس کانفرنس کے فوراً بعد اُن کا دہلی واپس جانے کا پروگرام طے ہوا جس روز مجھے جموں یونی ورسٹی میں شعبۂ اُردو کا چارج لینا تھا۔

صبح کو راج بھون میں وزیرِ اعظم کی پریس کانفرنس ہوئی۔ اُس کے بعد وہ ہیلی کاپٹر سے سری نگر ایئر پورٹ کو روانہ ہوئے۔ جموں کے طیارے کی پرواز ذرا بعد میں تھی۔ وزیرِ اعظم صاحب کے طیارے نے اُڑان بھری تو میں نے دُوسرے طیارے کے ذریعے سے جموں کا رُخ کیا اور

یہاں آتے ہی اپنے فرائضِ منصبی سنبھال لیے۔ اُس وقت میرا دل برنی صاحب کے لئے جذباتِ تشکّر سے لبریز تھا کہ اگر وہ میرا استعفیٰ منظور کرانے کے لئے خاص طور سے کوشش نہ کرتے تو میرے جموں آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

مرارجی ڈیسائی یا جنتا پارٹی کی کولیشن وزارت زیادہ مدّت نہ رہی۔ اندرا جی پھر وزیرِ اعظم کے طور پر واپس آ گئیں۔ برنی صاحب اُڑیسہ کے چیف سیکریٹری بن کے بھُبنیشور تشریف لے گئے۔ وہاں ان سے تین بار ملاقات کا موقع ملا۔ ایک ملاقات کا ذکر تو میں کر چکا ہوں باقی میرے دو سفر دو اسکالروں کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے وائیوا کے سلسلے میں ہوئے۔ ان تمام ملاقاتوں میں اُردو ادب اور اِقبالیات ہی بات چیت کا موضوع رہے۔ اور وہ رشتۂ اِقبالیات جو اِقبال نمائش کے وقت ایک ہلکی سی جھلک دکھانے کے بعد روپوش ہو گیا تھا پھر نمایاں ہوا اور خدا کے فضل و کرم سے آج تک قائم ہے۔

بھُبنیشور سے برنی صاحب حکومتِ ہند کے ہوم سیکریٹری کے طور پر پھر دہلی تشریف لائے لیکن مجھے ان کے وزارتِ اطلاعات ونشریات کے زمانے کا ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے، سوچتا ہوں پہلے اس کا ذکر کر دوں۔

راقم التحریر کی مرتّب کی ہوئی اقبال نمائش اوّل اوّل سری نگر میں منعقد ہوئی۔ اس کے بعد ملک کے بعض اور علمی اور ادبی مراکز میں مثلاً دہلی، علی گڑھ، لکھنؤ، چنڈی گڑھ، بمبئی، جموں، وینم باڑی (تمل ناڈو)، حیدر آباد وغیرہ۔ تین چار برس تک ملک میں اس کا بہت غلغلہ رہا لیکن بعد میں اچانک اس کے چھے سو سے زائد blow-up کی ہوئی تصویروں کے پینل اس طرح زیبِ طاقِ نسیاں ہوئے کہ ۱۹۷۷ء میں ان کا سراغ لگانا مشکل ہو گیا۔ سُراغ کیا لگتا وزارتِ اطلاعات ونشریات کے محکمہ ڈی۔اے۔وی۔پی نے اس نمائش کو بھی "Grow more food" کی طرح کی یا "ہم دو ہمارے دو" کے انداز کی کوئی نمائش سمجھا اور ان تمام پینلوں کو گودام میں ڈال دیا جہاں یہ ٹوٹ پھوٹ کر بالکل ناکارہ ہو گئے۔

۱۹۷۷ء کا سال تو صحیح معنوں میں اقبال صدی تقاریب کا سال تھا۔ حکومتِ ہند کے فلمز ڈویژن کو علامہ اقبال پر ڈاکومینٹری تیار کرنا تھی چنانچہ یہ کام سردار جعفری کے سپرد ہوا۔ سردار جعفری اس ڈاکومینٹری کے پروڈیوسر تھے خواجہ احمد عباس ڈائریکٹر اور راقم التحریر ایڈوائزر' چونکہ ہم تینوں میں راقم التحریر ہی روزِ اول سے اس نمائش کے ساتھ وابستہ رہا تھا اس لیے ہم تینوں سردار جعفری، خواجہ احمد عباس اور راقم التحریر، ڈاکومینٹری کی تکمیل کے لئے دہلی میں جمع ہوئے۔ سب سے پہلے تو میرا کام یہی تھا کہ نمائش کے پینل نکلوا کر انہیں یکجا کیا جائے تا کہ کام کی ابتداء ہو سکے۔ لیکن پینل تھے کہاں؟ کسی گودام میں سے ٹوٹے پھوٹے تختے برآمد ہوئے جن سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے میرے پاس تمام تصویروں کے Contact prints موجود تھے۔ لیکن Contact prints اُس وقت تک بیکار تھے جب تک اُنھیں مناسب سائز کی عمدہ تصویروں میں منتقل نہ کر لیا جاتا۔ یہ مسئلہ اب کے برنی صاحب کے سامنے پیش ہوا اور ان کی بدولت دو چار دن کے اندر اندر دوبارہ تصاویر تیار ہو گئیں جو بصورتِ دیگر ایک ناممکن کام تھا۔ خواجہ احمد عباس، سردار جعفری اور اِس خاکسار نے مل جل کے تصاویر کا انتخاب کیا اور نتیجتاً سردار جعفری کی شبانہ روز کی محنت سے یہ ڈاکومینٹری تیار ہوئی۔ یہ ڈاکومینٹر پاکستان میں بھی دِکھائی گئی اور ہندوستان میں بھی کئی موقعوں پر اس کی نمائش ہوئی۔ گویا برنی صاحب کی بدولت اقبال نمائش ایک بار پھر زندہ ہوئی اور اب نہ جانے وہ پینل کس عالم میں ہیں اور کہاں ہیں لیکن کم از کم اتنا تو ہوا کہ اقبال پر ڈاکومینٹری بن گئی اور وہ ڈاکومینٹری اب فلمز ڈویژن کے پاس محفوظ ہے .... آج بھی اتنی مدت گزر جانے کے بعد جب مُجھے اقبال نمائش کا خیال آتا ہے تو گجرال صاحب اور قدوائی صاحب کے ساتھ ہی ساتھ برنی صاحب کے عشقِ اقبال کی تصویر بھی میری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

اور برنی صاحب کا یہ عشقِ اقبال صرف اقبال نمائش تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اُنھوں نے اقبال کے متعلق Key-note addresses کی صورت میں اور اپنی تصانیف کی صورت

میں ملک اور ملک کے ادب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ ان کے ذکر کے بغیر ہندوستان میں اقبالیات کا ذکر مکمل نہیں سمجھا جاتا۔

اس مقالے میں جو جموں سے دہلی اور دہلی سے جموں تک کے ایک ریل کے سفر میں لکھا جا رہا ہے اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اقبال پر مظفر حسین صاحب برنی کی تحریروں پر بحث کی جا سکے لیکن بحث کی ضرورت اس لئے بھی نہیں ہے کہ برنی صاحب کے دو Key-note addresses جو اُنھوں نے اقبال سیمینار بھوپال اور اقبال انٹرنیشنل سیمینار حیدر آباد میں پڑھے مُلک کے متعدد رسائل اور اخبارات میں چھپ کر اہلِ نظر کے سامنے آ چکے ہیں۔ اسی طرح اقبال پر ان کی دو کتابیں (اقبال محبِ وطن) اُردو اور انگریزی میں تو خیر چھپی ہی ہیں اب مُلک کی دُوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہو کر چھپ رہی ہیں اور یہ دونوں کتابیں' صرف یہی نہیں کہ اپنے وطنِ عزیز میں اقبالیات کا نظریہء وطنیت سمجھنے کے لئے منارِ نُور کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ یہ نُور کے ایسے مینار ہیں جن کی روشنی ہندوستان کی سرحدوں سے باہر نکل کے دُور دُور تک فضا کو نُورانی بنا رہی ہے۔

گوپال مِتّل

گوپال مِتّل سے میری پہلی ملاقات آج سے تینتالیس برس قبل لاہور میں ہوئی' اور یہ ملاقات محض اِتفاقیہ تھی۔ کرپال سنگھ بیدار مجھے مولانا تاجور مرحوم کے ہاں لے گئے تھے۔ وہاں گوپال مِتّل پہلے سے موجود تھے مولانا کے ساتھ اپنی اس ملاقات کا ذکر میں اپنی کتاب ''آنکھیں ترستیاں ہیں'' میں تفصیل سے کر چکا ہوں۔ یہاں مجھے یہ لکھنا ہے کہ گوپال مِتّل اُس زمانے میں غالباً ROYIST تھے۔ رائے اِزم کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں مارکسزم سے جاملتے ہیں۔ گوپال مِتّل مولانا کے ساتھ بات چیت میں رائے اِزم کی خوبیاں اُنھیں بتا رہے تھے۔ مولانا جب بات کرتے تھے تو اُن کی تان کمیونسٹوں کی مخالفت پہ ٹوٹتی تھی۔ آخر مولانا نے یہ کہہ کے بات ختم کی کہ گوپال مِتّل! تم ہزار کمیونسٹ بنو لیکن جب کمیونسٹوں کی حکومت آئے گی تو وہ سب سے پہلے تمھیں نشانہ بنائیں گے کیونکہ تم کوٹ اور پینٹ پہنتے ہو اور اکثر انگریزی میں بات کرتے ہو۔ خدا معلوم مولانا کے دِل میں کمیونسٹوں یا کمیونزم کا کیا تصوّر تھا۔ لیکن اُن کے اس جواب پر ہم

سب نے ایک قہقہہ لگایا اور گوپال مِتّل نے بھی یہ دیکھ کر کہ اس سیاسی بحث میں اُن کی اور مولانا کی WAVE LENGTH ایک نہیں ہے بات کو ختم کیا۔

مولانا سیاست کے میدان کے مرد نہیں تھے۔ اُن کا میدان دُوسرا تھا۔ گوپال مِتّل کئی میدانوں کے مرد تھے اور ہیں اور اُس پہلی ملاقات میں جس بات نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا وہ یہ تھی کہ جو اِستدلال میں نے گوپال مِتّل کی بات میں دیکھا اس کا تجربہ شاید اس سے پہلے مُجھے نہیں ہُوا تھا۔

اُس وقت میری عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ گوپال مِتّل عمر میں مُجھ سے دس برس بڑے ہیں۔ بی اے کا امتحان گارڈن کالج راولپنڈی سے پاس کر کے میں لاہور آیا تھا۔ سیاسی تقریریں اکثر لیڈروں کی میں نے سُنی تھیں لیکن کسی بزمِ احباب میں سیاست کے موضوع پر ایسی مدلّل بات سننے میں نہیں آئی تھی۔

میں لاہور' ایم اے میں داخلہ لینے کے لیے آیا تھا لیکن ایسی ہی محفلیں زنجیرِ پابن گئیں۔ اور ایم اے میں داخلہ ملتوی ہوتا چلا گیا۔ اِسی آوارہ گردی کے دوران میں وقار انبالوی نے مُجھے روزانہ ''ملاپ'' میں ملازمت دِلوادی ——— گوپال مِتّل اُس زمانے میں ''بھارت ماتا'' میں کام کرتے تھے جس کے مدیرِ اعلیٰ لالہ رام پرشاد تھے۔ جہاں تک میرا خیال ہے مِتّل اُس میں دو ایک کالم مستقل طور پر لکھتے تھے۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ایڈیٹوریل بھی کبھی کبھار لکھا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب میں اُردو صحافت ہندو صحافت اور مُسلم صحافت میں بٹی ہوئی تھی۔ ''زمیندار''، ''احسان''، ''شہباز''، ''انقلاب''، مسلم اخبارات تھے۔ ''پرتاپ''، ''ملاپ''، ''بندے ماترم''، ''ویر بھارت'' اور ''بھارت ماتا'' ہندوؤں کے اخبار تھے اور حقیقت یہ ہے کہ مسلم اخبارات کی صحافت کا معیار ادبی اعتبار سے ہندو اخبارات کے مقابلے میں کہیں بہتر تھا۔ مُسلم اخبارات میں لکھنے والے تھے ظفر علی خان، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، نصر اللہ خان عزیز، ابوسعید بزمی، حمید نظامی،

حاجی لق لق، چراغ حسن حسرت اور اس پائے کے دیگر ادیب۔ ان کے مقابلے میں ہندو اخبارات کا پلڑا بہت ہلکا تھا۔ اُن کی ادبی آبرو صرف دو اہلِ قلم کے ہاتھ میں تھی۔ ایک میلا رام وفا اور دوسرے گوپال متّل۔ وقار انبالوی جب کبھی ہندو اخبارات میں آجاتے تھے تو ان اخبارات کا ''پرتاپ'' ہو یا ''ملاپ'' ادبی پایہ بلند ہو جاتا تھا ورنہ ان اخبارات کی نظم و نثر اکثر مولانا سالک اور اظہر امرتسری کی طعن و تشنیع کا نشانہ رہتی تھی۔ میلا رام وفا کا کمال اُن کی سیاسی موضوعات پر ہنگامی نظموں میں نظر آتا تھا۔ مثلاً ''اے فرنگی'' کے عنوان سے اُن کی متعدد نظمیں ایک زمانے میں بہت مشہور ہوئیں۔ گوپال متّل کی بات دُوسری تھی۔ اُنھوں نے اس طرح کی ہنگامی نظموں میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا اُن کا کمال اُن کی وہ نثریت تھی جو ان کی سیاسی نثر میں نظر آتی تھی۔ اور اس میں استدلال کا جو پہلو ہوتا تھا اُس کا تعریفی ذکر اکثر مجھے دُوسرے اخبارات کے دفتروں میں سننے میں آتا تھا۔ عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر کو میں نے اُس زمانے میں بھی گوپال متّل کا رطب اللّساں پایا۔

شاعری کے لیے اُن کا میدان دُوسرا تھا۔ ''شاہکار''، ''ادبِ لطیف''، ''سویرا'' اور ''ادبی دُنیا'' میں اُن کا کلام شائع ہوتا تھا۔ روزنامہ اخبارات کو اُن کی شاعری نے کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ''شاہکار'' کے تو گوپال متّل مدیر بھی رہے اور نہ صرف یہ کہ مولانا تاجورؔ گوپال متّل کے دورِ ادارت میں ''شاہکار'' کے معیار سے پوری طرح مطمئن تھے بلکہ مُلک کے علمی اور ادبی حلقوں میں ''شاہکار'' کا پایہ اعتبار اُس زمانے میں بہت بلند رہا۔

اخبارات کی شاعری سے یاد آیا۔ ایک دفعہ میں نے گوپال متّل کی ایک نظم غالباً ''بھارت ماتا'' ہی میں دیکھی۔ یہ اس اخبار کا شیوراتری نمبر تھا اور یہ نظم سوامی دیانند سرسوتی کی تعریف میں تھی۔ مُجھے معلوم تھا کہ عقیدے کے اعتبار سے گوپال متّل آریہ سماجی نہیں ہیں۔ میرے والدِ محترم آریہ سماجی تھے۔ گویا میں ایک آریہ سماجی گھر میں پیدا ہوا تھا۔ اور جب ہم لوگ راولپنڈی میں رہتے تھے تو ہمارے گھر کے سامنے آریہ سماج مندر تھا۔

سڑک کے اُس پار ہر اتوار کی صبح کو اس میں جلسہ ہوتا تھا اور ویسے بھی ہر تہوار کے موقع پر اس مندر میں جلسے ہوتے رہتے تھے۔ ہم گلی محلّے کے تمام ہندو لڑکے بڑے شوق سے اُن جلسوں میں جاتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب آریہ سماج میں اُردو اور فارسی کے علماء بڑی تعداد میں تھے۔ اب تو شاید کوئی ڈھونڈے سے نہ ملے۔ اگرچہ سوامی شردھانند، پنڈت لیکھ رام اور گنگا رام کا دور جاچکا تھا لیکن لالہ لاجپت رائے، پنڈت چموپتی ایم. اے، مہاتما آنند سوامی، مہاشے کرشن اور مہتہ جے مُنی کی بدولت آریہ سماج میں ہندی کے ساتھ ساتھ اُردو کا معیار بھی خاصا بلند رہا۔ آخر الذکر پانچ حضرات کی تقریروں کی گونج ابھی تک میرے کانوں میں موجود ہے۔ ان تقریروں سے متاثر نہ ہونا ممکن نہیں تھا چنانچہ آریہ سماج کے ساتھ میرا تعلقِ خاطر ایک مدّت تک رہا اور اُس زمانے میں اگرچہ میں لاہور آنے کے بعد کسی آریہ سماج مندر میں نہیں گیا (کیونکہ راولپنڈی میں تو آریہ سماج مندر بالکل گھر کے سامنے تھا اور لاہور میں ایسی صورت نہیں تھی) لیکن آریہ سماج کے لٹریچر اور ہندو دھرم کی جانب اُس روّیے سے جو آریہ سماج نے پیش کیا تھا۔ میرا دِلی قُرب ایک زمانے تک باقی رہا۔ وجہ یہ تھی کہ ہندو دھرم کی جانب سے آریہ سماج کے بانی کی APPROACH میری نظر میں وہی تھا جو اقبال اور ابوالکلام آزاد کی اسلام کی جانب یعنی اَفکارِ الٰہیہ میں تشکیلِ جدید یا RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT۔ چنانچہ جب لالہ سورج بھان نے وید منتروں کے انگریزی ترجموں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے کتابچے شائع کیے تو میں نے وہ بڑے شوق سے پڑھے۔ وہی لذّت جو مُجھے وید منتروں کے ان ترجموں میں ملی تھی، بہت بعد میں جا کے مُجھے محمد پکھتال کے انگریزی ترجمہ قرآن میں نظر آئی۔

تو میں گوپال متّل کی بات کر رہا تھا۔ نظم بہت عمدہ تھی اور اُس سطح سے کہیں بلند تھی جو ہندو اخبارات کی عام سطح نظم تھی۔ پنجاب کے ہندو اخبارات میں سے اگر اُس دور میں میرے والدِ محترم جناب محروم، جنشی مہاراج بہادر برق، میلا رام وفا اور وقار انبالوی کی نظمیں خارج کردی جائیں تو

شاعری کے نام سے جو کچھ باقی رہ جائے گا وہ پوچ گوئی سے بہتر سطح کا نہیں ہوگا۔ اب جو میں نے ''بھارت ماتا'' میں گوپال مِتّل کی نظم دیکھی اور اتنی بلند پایہ نظم تو میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ میں نے وہ دو تین بار پڑھی اور مجھے زبانی یاد ہوگئی۔ غالباً اُسی روز یا دُوسرے روز گوپال مِتّل سے راہ چلتے ملاقات ہوگئی۔ اُن کے ساتھ اُس وقت چودھری نذیر احمد اور باری علیگ بھی تھے۔ میں نے اس نظم کا تعریفی ذکر کیا۔ ظاہر ہے کہ ہر شاعر اپنی نظم کا تعریفی ذکر سُن کے خوش ہوتا ہے خواہ وہ اس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ گوپال مِتّل کو بھی نظم کی تعریف پسند آئی ہوگی۔ مِتّل نے مجھ سے پوچھا اس وقت کہاں جا رہے ہو۔ میں نے جھوٹ موٹ کہا کہ آریہ سماج کا سالانہ جلسہ ہو رہا ہے وہاں جا رہا ہوں۔ چودھری نذیر احمد بولے لیکن تمھارا آریہ سماج سے کیا تعلق؟ میں نے کہا اس وقت تک تو کوئی تعلق نہیں تھا لیکن مِتّل صاحب کی نظم نے اِتنا متاثر کیا ہے کہ میرا سویا ہوا ایمان بیدار ہوگیا ہے۔ مِتّل صاحب نے فوراً ہی کڑک کر کہا BUT MAN ! I AM NOT AN ARYA SAMAJIST میں نے کہا لیکن اِس کا کیا علاج کہ میں نظم سے بے حد متاثر ہوا ہوں اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب آریہ سماج مندر جا رہا ہوں۔ اب مِتّل کو کوئی جواب نہ سوجھا، جس پر چودھری نذیر احمد اور باری علیگ نے قہقہہ لگایا اور باری نے ہنستے ہوئے مِتّل سے کہا: ''اور نظمیں لکھو آریہ سماج کی تعریف میں۔'' یہ غالباً پہلا موقع تھا اور شاید واحد موقع تھا جب میں نے مِتّل کو لاجواب ہوتے ہوئے دیکھا۔ ورنہ گوپال مِتّل اور ہری چند اختر کو جواب سے مجبور شاید ہی کبھی کسی نے دیکھا ہو۔

زبان اور اُس کی باریکیوں پر گوپال مِتّل کی بڑی گہری نظر ہے۔ علمی اور ادبی دُنیا میں مِتّل کی ایک مسلمہ حیثیت ہے۔ اُس زمانے میں بھی جس کی میں بات کر رہا ہوں، مولانا صلاح الدّین احمد، میاں بشیر احمد اور راجہ حامد علی خاں ہمیشہ گوپال مِتّل کی نظم و نثر کا ذکر تعریفی الفاظ میں کیا کرتے تھے۔ میرے اُستاد آقا بیدار بخت مرحوم تو ان کی نظم و نثر کا اکثر ذکر کرتے تھے اور ہمیشہ تعریفی انداز میں۔

قیامِ لاہور کے دوران میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں اور گوپال مِتّل ایک ہی مکان کے

دو مختلف حصّوں میں مقیم رہے۔ ادبی تعلقات پر مبنی دوستی اور چیز ہے اور ایک ہی مکان میں رہنا دُوسری بات۔ اکبر الٰہ آبادی نے ایسے ہی موقعوں کے لیے تو کہا ہے ؎

اکبر کی بھلائی اور بُرائی پوچھ محلے والوں سے

دیوان تو ہم نے بھی دیکھا ہے شعر تو اچھے کہتا ہے

اور اِس طرح کے قیام کا جو تاثر آج تک باقی ہے وہ یہ ہے کہ یہ مختصر سا دور میری زندگی کا اِنتہائی خوش گوار دور تھا۔ دُوسری جنگِ عظیم اسی زمانے میں شروع ہوئی تھی۔

میری تنخواہ اُس وقت بہت کم تھی۔ میں تیس روپے ماہانہ سے ترقی کرتے کرتے سو روپے ماہانہ تک پہنچا تھا۔ تنخواہ کے اِضافے کے لالچ میں، مَیں نے کسی ایسی ملازمت کے لیے درخواست دے دی جو جنگ سے وابستہ تھی۔ شاید لاہور سے باہر یا مُلک سے باہر بھی جانا پڑتا۔ میری بیوی کو یہ بات بہت ناپسند تھی۔ اُس نے گوپال مِتّل سے بات کی۔ گوپال مِتّل نے مجھے بہت سمجھایا کہ جس ملازمت کے لیے تم نے درخواست دی ہے وہ لغو قسم کی ملازمت ہے۔ انٹرویو وغیرہ کے لیے بلاوا آئے تو نہ جانا۔ میں نے ان کی بات نہ مانی۔ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ والدِ محترم اُن دِنوں راولپنڈی میں تھے۔ مِتّل نے انھیں لکھا وہ آئے اور اُنھوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر کے مجھے اِنٹرویو میں جانے سے روکا۔ معلوم نہیں مجھے انٹرویو میں کامیابی ہوتی یا نہ ہوتی، لیکن بعد میں جب جنگ نے طول پکڑا اور مُلکی حالات واضح طور پر سامنے آئے تو گوپال مِتّل کی اصابتِ رائے پر مُجھے ایمان لانا پڑا۔

صحافت گوپال مِتّل کا پیشہ رہا ہے۔ اس میں ادبی صحافت بھی شامل ہے۔ تقسیم ملک سے قبل ''نوائے وقت'' ہفتہ وار جب ''نوائے وقت'' روزنامہ میں تبدیل ہوا تو حمید نظامی مرحوم نے انھیں ''نوائے وقت'' کے عملے میں شریک ہونے کی دعوت دی جو مِتّل نے منظور کر لی۔ وہاں مِتّل ایک شفٹ کے انچارج مقرر ہوئے۔ حمید نظامی مرحوم کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ ایک بار جب شفٹ کے انچارج کی حیثیت سے مِتّل صاحب نے اسٹاف کے ایک رکن کے خلاف فیصلہ دیا تو

حمید نظامی نے ان کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کی۔ یہ واقعہ مُجھے حمید نظامی مرحوم نے خود سُنایا تھا۔ واضح رہے کہ ''نوائے وقت'' میں جتّل کے علاوہ تمام اراکین مسلمان تھے۔

تقسیم ہند کے بعد کچھ مدّت ایسی بھی گزری کہ میں اور گوپال جتّل ایک ہی اخبار کے دفتر میں ملازم رہے۔ اِس میں مُجھے اور گوپال جتّل کو زیادہ دیر تک کام نہیں کرنا پڑا۔ مُجھے تھوڑی ہی مدّت میں پبلی کیشنز ڈویژن کے شعبہء اُردو میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی اسامی مل گئی اور گوپال جتّل نے ماہنامہ ''تحریک'' جاری کیا۔ اس تھوڑی ہی مدّت میں مُجھے گوپال جتّل کی ایک اور صلاحیت کو بہ نظر غائر دیکھنے کا موقع ملا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انگریزی سے اُردو میں بامحاورہ ترجمے پر گوپال جتّل کو غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ میں خود اگر کہیں ترجمے میں اٹکتا تھا یا کسی ترجمے کے متعلق مُجھے شک ہوتا تھا تو میں جب تک گوپال جتّل سے بات نہیں کر لیتا تھا مجھے اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ اس دفتر میں باقی تمام حضرات بس واجبی قابلیت کے تھے۔ زبان کی باریکیاں تو خیر ایک طرف رہیں معمولی باتیں بھی اُن کے حدودِ علم سے باہر تھیں۔ بات چیت میں بھی سوائے ایک دُوسرے پر ''اعتراضات'' کے یہ لوگ اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس ماحول میں میری اور گوپال جتّل کی قربت میں مزید اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن نہ جانے ایک دن کیا ہوا میں اور گوپال جتّل آپس میں جھگڑ پڑے۔ اب مُجھے اِس وقت بالکل یاد نہیں کہ اس کا سبب کیا تھا۔ اس بات کو چونتیس برس بھی تو ہو گئے ہیں۔ اور بات بھی کوئی بہت معمولی ہوگی لیکن اتنا مُجھے یاد ہے کہ نتیجتاً ہم دونوں میں بول چال بند ہوگئی اور تین چار دن اسی طرح گزر گئے۔ اب میری دِقّت یہ تھی کہ سارے دفتر میں علمی یا ادبی موضوعات پر بات کرنے والا اور کوئی نہیں تھا۔ کسی لفظ کی سند تلاش کرنے کے لیے اگر کسی شعر کا خیال آتا تھا تو کسی سے پوچھ نہیں سکتا تھا کہ یاس یگانہ یا مولانا ظفر علی خاں یا حسرت موہانی کے فلاں شعر کا پہلا مصرع کیا ہے یا دُوسرا مصرع کیا ہے، یا فلاں غزل کا مطلع یا مقطع کیا ہے، جوش کی فلاں نظم کا عنوان کیا ہے۔ عجیب گھٹن کی فضا تھی۔ غالباً گوپال

جتّل بھی یہی محسوس کر رہے تھے کہ ہم نے آپس میں بول چال بند کر کے خواہ مخواہ اپنے لیے ایک ضیق النفس کی فضا پیدا کر لی ہے۔ کوئی تین چار دن کے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ ہم دونوں اسی دفتر میں تنہا بیٹھے تھے۔ دونوں خاموش کہ گوپال جتّل نے قہقہہ لگایا اور اپنے ASSERTIVE لہجے میں بولے۔

MAN, WHY DON'T YOU SAY CLEARLY THAT WE HAVE MADE A MISTAKE IN QUERELLING WITH EACH OTHER!

اس پر مُجھے بھی ہنسی آ گئی کیونکہ جتّل صاحب نے میرے دل کی بات کہی تھی۔ چنانچہ بات ختم ہوگئی اور میں نے اس قیدِ تنہائی سے نجات پانے پر اطمینان کا سانس لیا۔

یہاں جتّل نے ایک اور عجیب وغریب بات بھی کہی اور وہ یہ کہ ''آزاد! اس سارے دفتر میں اور کوئی آدمی اس قابل بھی تو نہیں کہ اُس کے ساتھ جھگڑا کیا جائے۔''

جتّل اُس زمانے میں اپنے مخاطب سے بات کرتے ہوئے اکثر اُسے لفظ MAN سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ معلوم نہیں اب کیا صُورت ہے کیونکہ گزشتہ تیرہ برس میں تو ملاقات محض گاہے گاہے کی رہی ہے۔ میں ۱۹۶۸ء میں دہلی سے سری نگر چلا گیا۔ وہاں سے جموں آ گیا۔ جتّل صاحب بھی آج کل دریا گنج کو چھوڑ کر راجندر نگر جا چکے ہیں لیکن اب یہ پریم گوپال کے ماڈرن پبلشنگ ہاؤس کی بدولت پھر ملاقاتوں کی ایک صورت پیدا ہونے لگی ہے۔ خدا پریم گوپال جتّل کو تندرستی اور طویل عمر کی دولت سے نوازے اور ماڈرن پبلشنگ ہاؤس کو روز افزوں ترقی نصیب ہو۔ یہاں میں ایک بار آیا تو گوپال جتّل وہاں موجود تھے۔ تین چار گھنٹے اُن کے ساتھ بسر ہوئے تو یوں محسوس ہوا جیسے لاہور کا زمانہ واپس آ گیا ہو۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں ۱۹۴۸ء میں پبلی کیشنز ڈویژن میں آ گیا اور گوپال جتّل نے ماہنامہ ''تحریک'' جاری کیا۔ نیشنل اکیڈیمی جتّل کا ایک پُرانا اشاعتی ادارہ تھا جو اُنھوں نے لاہور میں جاری کیا تھا۔ دہلی میں اس کی بھی تجدید ہوئی۔ اُس وقت ہم دونوں میں ایک طرح کا ادبی صحافتی رشتہ پیدا ہو گیا۔ جتّل ''تحریک'' سے ستہ تھے بلکہ اس کے ایڈیٹر تھے۔ میں ''آج کل''،

''بساطِ عالم'' اور ''نونہال'' سے متعلق تھا۔ اگرچہ ان رسائل اور ''تحریک'' میں ایک بعد المشرقین تھا لیکن یہ ماحول ایک بار پھر باہمی ملاقاتوں کا ایک اچھا ذریعہ بن گیا۔ جوش ملیح آبادی شعبہ اُردو کے ایڈیٹر تھے۔ عرش ملسیانی اور بلونت سنگھ بھی اسی دفتر میں تھے۔ کچھ مدّت بعد ہری چند اختر بھی اس برادری میں شامل ہو گئے۔ عرش اور مثّل پرانے دوست تھے۔ دونوں لدھیانے میں ایک مدّت تک اکٹھا رہ چکے تھے۔ (غالباً مثّل نے لدھیانے سے اس زمانے میں ''صبحِ اُمید'' نامی ایک ماہنامہ نکالا تھا) اس لیے مثّل کبھی کبھار ''آج کل'' کے دفتر کا پھیرا کر لیا کرتے تھے۔

سیاسی خیالات کے اعتبار سے میں اس وقت تک اشتراکیت بلکہ اشتمالیت کا پورا پورا حامی بن چکا تھا، اور مثّل اس کے پورے مخالف، لیکن خیالات کا یہ اختلاف ہماری دوستی کے رستے میں کبھی حائل نہیں ہوا اور میں تو خیر اس قسم کا اشتراکی تھا جو حکومتِ ہند کا ایک افسر ہونے کے باعث اپنے خیالات کا اظہار بہت کھلم کھلا نہیں کرتا تھا۔ ساحر لدھیانوی تو کھلم کھلا اشتراکی تھے۔ ساحر کے ساتھ مثّل کی دوستی اور بہت گہری دوستی ساحر کی زندگی تک رہی اور ساحر کی موت پر مثّل نے ''تحریک'' میں جو اداریہ لکھا وہ ایک تحریر نہیں ہے بلکہ خونِ دل کی بوندیں ہیں جو مثّل کے قلم سے انتہائی شدتِ غم کے عالم میں کاغذ پر ٹپکی ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مثّل اور میں جوش صاحب کے کمرے میں بیٹھے تھے، علمی اور ادبی باتیں ہو رہی تھیں۔ نہ جانے جوش کو کیا سوجھی کہ مثّل کے سامنے اشتراکیت بلکہ اشتمالیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ اس معاملے میں مثّل علم کا سمندر ہے۔ جوش کا لگاؤ سیاست کے ساتھ محض ایک جذباتی قسم کا تھا ——— اور جوش ہزار منطق کرتے رہیں مثّل ایسے جغادری کے سامنے کہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ آخر اس بات چیت اور مباحثے کی تان یہاں آکر ٹوٹی ——— مثّل صاحب نے سوشلزم کی ماہیت بیان کرتے ہوئے یہ کہا کہ جوش صاحب! سوشلزم کی جو تعریف آپ نے کی ہے اور جو خوبیاں آپ نے بیان کی ہیں، اُن کے پیشِ نظر سوشلزم رُوس میں نہیں بلکہ برطانیہ میں ہے۔ جوش اس وقت بحث ہار چکے تھے۔ کہنے لگے: ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ سوشلزم اپنی صحیح

صورت میں برطانیہ ہی میں ملتا ہے۔ اب مثّل نے ٹرمپ کارڈ پھینکا اور کہا کہ جوش صاحب تو گویا آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ روس میں نہ سوشلزم ہے نہ کمیونزم۔ جوش نے جواب میں اتنا کہا کہ ''ہاں صاحب یہ تو صحیح ہے کہ روس میں نہ سوشلزم ہے نہ کمیونزم۔'' یہ تھی جوش صاحب کی ترقی پسندی اور ترقی پسندی کے بارے میں اُن کا علم، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مثّل کے ساتھ بحث کرنا آسان نہیں۔

جب مثّل صاحب چلے گئے تو میں نے جوش صاحب سے کہا: جوش صاحب! آج ساری بات چیت بہت غلط لائنوں پر چلی۔ کہنے لگے کیسے؟ میں نے کہا یہ آپ نے کیا کہہ دیا کہ روس میں نہ سوشلزم ہے نہ کمیونزم، اور صحیح سوشلزم اگر کہیں ہے تو برطانیہ میں ہے۔ جوش بولے، ہاں مُجھے بھی کچھ خیال رہا کہ میں غلط بات کہہ رہا ہوں لیکن جب میں ایک غلط بات کہہ رہا تھا تو آپ نے مُجھے ٹوکا کیوں نہیں، اور آپ نے مثّل سے کیوں نہیں کہا کہ سوشلزم روس میں اپنی صحیح صورت میں موجود ہے۔ میں نے کہا ''مثّل سے بحث کرنا آسان نہیں اور سیاسیات میں بحث محض ایک ذہنی جمناسٹک ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ سوشلزم کی صحیح ترین صورت رُوس میں ہے اور سوشلزم دُنیا کے تمام دُکھوں کا علاج ہے۔ ہندوستان ایسے ملک کی جہاں انفرادی سطح پر بددیانتی کی لعنت سے بہت کم لوگ محفوظ ہیں، نجات صرف کمیونزم کو اپنانے میں ہے۔'' اس پر جوش طیش میں آگئے اور بولے کہ ''میں بھی یہی سمجھتا ہوں اور آپ کا ہم خیال ہوں لیکن آپ نے اس موضوع پر مثّل کے ساتھ بحث کیوں نہیں کی۔''

میں:- محض اس لیے کہ اس بحث کے لیے جو حقائق اور DATA ازبر ہونا چاہئے وہ میرے حافظے میں نہیں اور یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر بحث صرف FACTS AND FIGURES کے زور ہی سے ہو سکتی ہے اور پھر میرے یا آپ کے لئے یہ کیا ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو بحث مباحثے کے لیے بھی ہمیشہ تیار رکھیں۔ میرے لیے میرا یہ عقیدہ ہی کافی ہے کہ میں اس وقت تک جو کچھ ہوں اس کی تشکیل میں میرے اشتراکی خیالات کا بڑا حصہ ہے۔

جوش:- ہاں، لیکن اپنے خیالات کو مدلل طور پر پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ (جیسے وہ تھوڑی دیر قبل خود کر چکے تھے)

میں:- صحیح ہے لیکن اس کے لیے اور لوگ ہیں۔ ہم آپ اس طرح کی سیاسی بحثوں کے لیے پیدا نہیں ہوئے ''ہر کسے را بہر کارے ساختند۔''

جوش:- کون لوگ؟

میں:- مثلاً بنّے بھائی، سردار جعفری، فیض احمد فیض، مُلک راج آنند، لیش پال، آلِ احمد سرور، (سرور صاحب اُس وقت تک ادب میں ترقی پسند تحریک کے ایک رہ نما تسلیم کیے جاتے تھے) احتشام حسین، خلیل الرحمٰن اعظمی، جنھوں نے اس موضوع کا اس طرح مطالعہ کیا ہے کہ یہ اب ان کا جزوِ مزاج بن چکا ہے۔

آخر الذکر نام جوش صاحب کو پسند نہیں آیا۔ اس نام نے اُن کے چہرے پہ تکدّر کے آثار پیدا کر دیے لیکن اپنی دِلی کیفیت کو چھپاتے ہوئے بولے: یہ آپ نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ اب جب احتشام یا سردار یہاں آئیں تو مجھے یاد دلائیے۔ اُس وقت ہم مِتّل کو دعوت دیں گے کہ آ کر ان سے بحث کریں۔ میں نے عرض کیا جوش صاحب، چھوڑیے اس بات کو، یہ مُشتے بعد از جنگ والی بات ہے اور پھر ع۔ 'کارِ دُنیا کسے تمام نہ کرد' ــــــ سردار اور احتشام جہاں ہیں وہاں اپنے اپنے دائرے میں یہ کام بخوبی انجام دے رہے ہیں ــــــ اور یہ موضوع اس طرح ختم ہو گیا۔

بات میں گوپال مِتّل کی کر رہا تھا اور درمیان میں ایک بہت ہی محبوب شخصیت کا ذکر آ گیا........ جوش ملیح آبادی کا ــــــ اور: لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

تو اُن دِنوں ''آج کل'' کے دفتر میں ترقی پسند ادیبوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ سردار جعفری، ساحر، احتشام حسین، آلِ احمد سرور، ظ۔ انصاری جب کبھی دہلی آتے تو ''آج کل'' کے دفتر میں ضرور آتے تھے۔ اُن کو یہاں کھینچ لانے کا سبب جوش صاحب کی شخصیت تھی جن کی ترقی پسندی محض رومانوی انداز کی ہونے کے باوجود اُردو شاعری کو جلا بخش رہی تھی۔ ان محفلوں کا نتیجہ یہ تھا کہ

میں اپنے اشتراکی خیالات کی حمایت میں پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میرے پہلے مجموعہ ، کلام '' بیکراں '' میں تو ان خیالات کی ہلکی سی جھلک موجود ہے لیکن دوسرا مجموعہ ، کلام ''ستاروں سے ذرّوں تک'' انھی خیالات سے مملو ہے۔ ''ستاروں سے ذرّوں تک'' کے بعد میرا تیسرا شعری مجموعہ چھپا۔ اس میں ایک باب ہے ''چند ملاقاتیں عالمِ خیال میں'' اور یہ ملاقاتیں بنّے بھائی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری اور ممتاز حسین کے ساتھ ہیں جو اُن دِنوں جیل میں تھے۔ گوپال مِتّل نے اِس نظم پر ''تحریک'' میں ایک شدید قسم کا اِدارتی مقالہ لکھا۔ اب اس وقت یہ ایڈیٹوریل تو میرے سامنے نہیں ہے اس لیے لفظ بہ لفظ یہاں لکھنے سے تو قاصر ہوں لیکن لب لباب اس ایڈیٹوریل کا یہ تھا کہ یہ اشتراکی خیالات رکھنے والا پبلی کیشنز ڈویژن (حکومت ہند) میں نائب مدیر ہے اور حکومت اس طرح کے سیاسی خیالات کی اجازت کیوں دے رہی ہے۔

اصولاً مِتّل کی بات ٹھیک تھی۔ حکومت کے کسی ملازم کو اپنے سیاسی خیالات کی نشر و اشاعت کی اجازت نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن مِتّل کی تحریر کی زد چونکہ مجھ پر پڑتی تھی اس لیے قدرتی طور پر مِتّل کی بات مُجھے ناگوار گزری، مِتّل نے اس کے ساتھ ایک اور ''زیادتی'' یہ کی کہ چند ماہ بعد اپنے اس ایڈیٹوریل کو دوبارہ شائع کر دیا۔ میں نے عرش سے کہا کہ مِتّل نے اصولِ دوستی کے خلاف بات کی ہے۔ عرش نے کہا کہ یہ مِتّل کے سیاسی CONVICTION کی بات ہے۔ جب وہ اس موضوع پر جواہر لعل نہرو اور نور الحسن کے خلاف لکھتا ہے تو تمہارے خلاف لکھنے سے کیوں گریز کرے گا۔ تمھیں چاہیے کہ تم اپنے خیالات کو اپنے تک ہی محدود رکھو۔ کسی وقت حکومت کی زد میں آ جاؤ گے اور اُس وقت چھٹکارا مشکل سے ہو گا۔

آخر ایک دن آیا کہ میں حکومت کے عتاب کی زد میں آ گیا۔ لیکن اس کے لیے مِتّل کا ایڈیٹوریل ذمہ دار نہیں تھا۔ وہ معاملہ ہی دُوسرا تھا۔ مِتّل نے جو بات لکھی تھی کھلم کھلا لکھی تھی۔ مجھ پر چُھپ کر وار نہیں کیا تھا اور کچھ مدّت بعد جب میں حکومت کے عتاب کا ہدف بنا تو اس کے پیچھے بعض دوستوں کی خفیہ اور درپردہ کوشش کارفرما تھی، وہ نظمیں ہی اور تھیں جن کے حسبِ منشاء ترجمے

حکومت تک پہنچائے گئے تھے۔ لیکن یہ واقعہ ایسا ہے جس کا تعلق میری ذات اور میرے سوانح حیات سے ہے موجودہ مقالے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

تو کہہ میں یہ رہا تھا کہ میں نے متل کے اس ایڈیٹوریل کا بُرا مانا اور متل سے میری ملاقات قریب قریب ختم ہوگئی لیکن اس قسم کے واقعات انسان کی زندگی پر کوئی پائدار اثر نہیں چھوڑتے۔ پائدار اثر چھوڑنے والی شے ہم سخنی اور ہم مزاجی ہے۔ آخر یہ کیفیت میرے تکدّر پر غالب آئی اور میں اپنی تشنگی شوق مٹانے کے لیے متل صاحب سے اُسی طرح ملنے لگا جس طرح پہلے ملا کرتا تھا۔

آج میں حکومت کا ملازم یا افسر نہیں ہوں۔ اور اپنے سیاسی خیالات کے اظہار میں کسی احتیاط یا مصلحت سے کام لینے پر مجبور نہیں۔ اور متل کو یہ سب معلوم ہے لیکن متل نے میرے اس عمل پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ اعتراض اُس وقت کیا تھا جب میں نے حکومت کا ایک افسر ہوتے ہوئے اُن سیاسی خیالات کا اظہار کیا تھا جو حکومت کے خیالات نہیں تھے۔ گویا گورنمنٹ سروینٹس کانڈکٹ رولز کی خلاف ورزی کی تھی۔ آج میں محسوس کرتا ہوں کہ متل اپنے اظہارِ خیال میں حق بجانب تھا اور یہی سبب ہے کہ یہ بات اُسی زمانے میں رفت وگزشت ہوگئی تھی اور اس کی جگہ اس کیفیت نے لے لی تھی جو ہم سخنی، ادبی ہم خیالی اور ہم مزاجی پر مبنی ہے۔ رہی اختلافات کی بات تو اس کے متعلق ڈاکٹر تاثیر مرحوم ایک بہت خوبصورت شعر کہہ گئے ہیں ؎

ہزار ہم سخنی ہو ہزار ہم نظری
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں

ابھی کچھ مدّت ہوئی، اُستادِ محترم ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک مقالہ میری نظر سے گزرا جس میں اُنھوں نے چلتے چلتے تقسیم ہند کے زمانے کا بالخصوص نگینہ بیکری کا ذکر کیا ہے۔ اُس میں گوپال متل کا ذکر اُنھوں نے خاص طور سے کیا ہے۔

اسی ماہ مئی کی بات ہے میں بزمِ تعمیر ادب کراچی کے مشاعرے میں اور کراچی یونیورسٹی میں ایک مقالہ پڑھنے کے لئے پاکستان گیا۔ وہاں ابوالاثر حفیظ جالندھری سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت دیر تک گوپال متل کا ذکر کرتے رہے اور ان کے متعلق پوچھتے رہے۔ صرف ڈاکٹر سید عبداللہ اور حفیظ جالندھری ہی پر موقوف نہیں ہے، مُجھے پاکستان جانے کا اتفاق جب بھی ہوتا ہے اور وہاں لاہور، کراچی، پشاور، اسلام آباد اور راولپنڈی میں نئے پرانے دوستوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ اور وہ لوگ ہندوستان کے اہلِ قلم کا یا اپنے اُن دوستوں کا جو ہندوستان میں ہیں، ذکر کرتے ہیں تو اس میں گوپال متل کا ذکر خاص طور سے ہوتا ہے اور:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

ہمارے حکیم صاحب

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے (غالبؔ)

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تقسیمِ ہند سے قبل بھی ہمدرد دواخانے کے نام سے اہلِ مُلک آشنا تھے لیکن تقسیمِ ہند کے بعد جس تیزی سے حکیم عبدالحمید کی نگرانی میں اِس دواخانے نے ترقی کی منزلیں طے کیں اور شہرت کا ایک اِنتہائی مقام حاصل کیا اس کی مثال ہندوستان میں شاید نہ مل سکے۔

حکیم عبدالحمید شروع میں اِس دواخانے کے مالک تھے۔ بعد میں اُنھوں نے اِسے قوم کے نام وقف کردیا اور اب اُن کی حیثیت اس دواخانے کے ایک نگران کی ہے۔ لیکن اب یہ محض دواخانہ نہیں ہے یہ ایک قومی اہمیت کا ادارہ ہے، اِنسٹی ٹیوشن ہے۔

ابھی میں نے کہا کہ اِس ادارے کی مثال شاید ہندوستان میں نہ مل سکے۔ مجھے اس جملے کے ساتھ یہ کہنا چاہئے تھا کہ اس کی ایک مثال پاکستان میں موجود ہے۔ کراچی میں حکیم

عبدالحمید کے برادرِ خورد حکیم محمد سعید نے اِسی نام سے ایک دواخانے کی بنیاد رکھی۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو میرا خیال ہے اس دواخانے کی بنیاد حکیم عبدالحمید اور حکیم محمد سعید کے والدِ محترم نے دہلی میں رکھی تھی۔ گویا یہ دونوں دواخانے آج دو الگ الگ مُلکوں میں ہونے کی وجہ سے اگرچہ قانونی اعتبار سے دو الگ الگ ادارے ہیں، ایک کا دُوسرے سے کوئی تعلق نہیں لیکن حقیقتاً یہ اُس شجرِ سایہ دار کی دو شاخیں ہیں جس نے ہندوستان میں اپنا سایہ دُور دُور کے مسافروں تک پہنچایا اور جو اُن کے والدِ محترم کی وجہ سے متحدہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل رہا تھا۔ ان دونوں اداروں کا آپس میں یہ رُوحانی تعلق برِصغیر ہند پاک کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں کیونکہ دونوں اداروں کے پیشِ نظر خدمتِ خلق کا مشن ہے اور چونکہ اس مشن سے ان اداروں نے کبھی رُوگردانی نہیں کی اِس لئے ہندوستان اور پاکستان کا ذکر کئے بغیر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ادارے بنی نوعِ انسان کی خدمت میں مصروف ہیں۔ رفاہِ عام کے لئے جس طرح ہندوستان کے ہمدرد دواخانے کے ساتھ متعدد ادارے وابستہ ہیں اسی طرح کراچی کے ہمدرد دواخانے کے ساتھ بھی متعدد علمی اور ادبی ادارے وابستہ ہیں۔

تقسیمِ ہند کے بعد دونوں مُلکوں میں اُردو ایک مظلوم زبان بن کے رہ گئی۔ اس کی ترقی کے لئے سچے جھوٹے وعدے اور دعوے دونوں مُلکوں میں ہوتے رہتے ہیں لیکن جو حقیقت ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں حکیم عبدالحمید اور پاکستان میں حکیم محمد سعید نے اُردو کے احیاء اور بقاء کے لئے جو کام کیا ہے وہ زبانِ اُردو کی تاریخ کا ایک نہ مٹنے والا باب ہے۔

مختصر لفظوں میں اگر میں بیان کروں تو یہ کہوں گا کہ پاکستان کی حکومت اُردو کو سارے پاکستان کی زبان بنانا چاہتی ہے۔ لیکن صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کے لوگ بڑی حد تک اور پنجاب کے لوگ کسی حد تک یہ شکایت کرتے رہتے ہیں کہ حکومت ان کی زبانوں کے لئے وہ سب کچھ نہیں کر رہی ہے جو اسے کرنا چاہئے۔ اس وقت سرائکی بھی ایک بڑی علاقائی زبان

بن کر سامنے آ رہی ہے۔ ہمارے مہاجرین کا ایک طبقہ ایسا ہے جو اُردو کو اپنی تہذیب و تمدن کی علامت سمجھتا ہے اور اِسے اپنے سینے سے لگائے بیٹھا ہے۔ اس طبقے کے ساتھ حکومت پاکستان اور حکومت سندھ نے جو سلوک کیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

ہندوستان میں صورتِ حال یہ ہے کہ اُردو کے خلاف اِس کے پُرانے مخالفین کی تمام مخالفتیں بڑی حد تک ختم ہو چکی ہیں۔ شمالی ہند میں ہندی کے قریب قریب تمام بڑے اہل قلم اُن اداروں کے ساتھ جو اُردو کے لئے کام کر رہے ہیں قدم بہ قدم چل رہے ہیں۔ جنوبی ہند میں اُردو کے خلاف نہ پہلے کوئی جذبہ تھا نہ اب ہے لیکن حکومت کسی بھی پارٹی کی ہو مسلمانوں کو اپنے ووٹ بینک کے طور پر استعمال کرنے کے لئے اُردو کو مسلمانوں کی زبان کہتی چلی آ رہی ہے اور مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لئے الیکشن مینی فیسٹو میں ''اُردو، اُردو'' کا شور مچانا شروع کر دیتی ہے۔ ہم اُردو والے جتنی بلند آواز سے کہتے ہیں کہ اُردو سارے ہندوستان کی زبان ہے، یہ ہماری مشترکہ تہذیب کی علامت ہے، سیاسی جماعتیں انتخابات کے زمانے میں اس سے بلند تر آواز میں اسے مسلمانوں کی زبان قرار دینا شروع کر دیتی ہیں۔ جس سے ایک تو ہمارے کام پر خاصی حد تک پانی پھر جاتا ہے دُوسرے سیدھے سادھے مسلمان ان کی باتوں میں آ جاتے ہیں۔ اور ان کو سچ مچ سیکولر سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہو کر پچاس برس سے اپنا مستقبل خراب کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان نام نہاد ''سیکولر'' جماعتوں نے مسلمانوں کو تعلیم دِلانے کے لئے کوئی قدم نہیں اُٹھایا اور انہیں اُس تعلیم سے بھی بیگانہ رکھا ہے جو انہیں عصرِ حاضر میں ترقی پسندی اور جدید طرزِ حیات سے آشنا کر سکتی تھی۔ یہ موقع پرست اور ابن الوقت قسم کی جماعتیں بڑی حد تک فرقہ پرست جماعتیں ہیں۔ لیکن اپنے سیکولر ہونے کا نقارہ زور شور سے بجانے کا فن جانتی ہیں اور اِس بات سے بھی آشنا ہیں کہ سیاست میں بار بار جھوٹ بولنا اچھی خاصی کامیابی کا ضامن بن جاتا ہے۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا ہے کہ حکیم عبدالحمید صاحب کے ساتھ ابتدا میں میری

ملاقات کب ہوئی۔ لیکن اِتنا یاد ہے کہ لاہور سے دہلی منتقل ہونے کے بعد اپنی چھوٹی بڑی علالت کے علاج کے لئے والدِ محترم کا اور میرا حکیم صاحب کے یہاں آنا جانا شروع ہو گیا۔ والدِ محترم کا انتقال ۱۹۶۶ء میں ہوا اور ۱۹۶۸ء میں میرا دہلی سے سری نگر تبادلہ ہو گیا اور حکیم صاحب سے علاج کرانے کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن جب تک علاج معالجے کا یہ سلسلہ جاری رہا حکیم صاحب اس توجہ اور عنایت سے علاج کرتے رہے کہ میں اُن کی محبت، شفقت اور ان کے احسانات کو فراموش نہیں کر سکتا۔ انھوں نے آج تک معائنے کی فیس تو اپنے کسی مریض سے نہیں لی اور یہی طریقہ کار ہمدرد دواخانے میں کام کرنے والے تمام اطبا کا رہا، لیکن ہم لوگوں سے حکیم صاحب کے زیرِ علاج رہنے کے بعد دوا کی قیمت بھی کبھی نہیں لی گئی۔ حکیم صاحب نسخے ہی پر ہدایت لکھ دیتے تھے یا غالباً کوئی علامت بنا دیتے تھے لیکن ہم نے نسخے میں کبھی دوا کی قیمت نہ لینے کی کوئی ایسی ہدایت نہ دیکھی جس کی بنا پر ہم سے قیمت نہیں لی جاتی تھی۔

حکیم صاحب مریض سے مرض کی تفصیل نہیں پوچھتے بلکہ نبض پر انگلی رکھ کر خود مرض کے بارے میں بتاتے ہیں۔ مجھے اِس طرح کے کئی تجربے ہو چکے ہیں۔ جب میں پریس انفارمیشن بیورو میں انفارمیشن آفیسر تھا تو میرے ایک افسر مادھو پرشاد ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر نے ایک دن مجھ سے کہا کہ حکیم عبدالحمید کی میں نے بہت تعریف سُنی ہے اور یہ بھی سُنا ہے کہ آپ کے اُن کے ساتھ اچھے مراسم ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں، دونوں باتیں درست ہیں۔ فرمایئے اس سلسلے میں کیا ارشاد ہے۔ کہنے لگے میرے ایک گھٹنے میں درد رہتا ہے۔ مجھے آج اُن کے پاس لے چلیں۔ میں نے حکیم صاحب کو ٹیلی فون کر کے اُن سے وقتِ ملاقات لے لیا اور مادھو پرشاد صاحب کو طے شدہ وقت پر ان کے پاس لے گیا۔ حکیم صاحب سے میں نے اُن کے گھٹنے کے درد کا ذکر نہیں کیا تھا اور مادھو پرشاد صاحب سے بھی کہہ دیا تھا کہ جب تک حکیم صاحب آپ سے خود نہ پوچھیں کہ کیا تکلیف ہے آپ کچھ نہ بتایئے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

جب ہم لوگ اُن کے مطب میں پہنچے تو حکیم صاحب نے اُن کی نبض پر اُنگلی رکھی، پھر دُوسرے ہاتھ کی نبض دیکھی اور سوال کیا کہ آپ کے کس گھٹنے میں درد رہتا ہے؟ بائیں میں؟ مادھو پرشاد حیرت زدہ رہ گئے اور مثبت میں جواب دیا۔ مختصر یہ کہ حکیم صاحب نے کچھ پوچھے بغیر مرض کی تشخیص کی اور نتیجتاً علاج کے بعد مادھو پرشاد صاحب خدا کے فضل و کرم سے صحت یاب ہو گئے۔ گھٹنے کا درد جاتا رہا۔

تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان سے ہندوستان آنے والے لوگوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ یہی حالت ہندوستان سے پاکستان جانے والے مہاجرین کی تھی۔ اسی ناگفتنی حالات کے دور کا زمانہ تھا۔ ایک ملاقات کے دوران میں جب مَیں نے والدِ محترم کے مجموعہ کلام ''گنجِ معانی'' کے دُوسرے ایڈیشن کی ایک جلد مولانا ابوالکلام آزاد کو پیش کی تو اُنھوں نے پوچھا کہ محروم صاحب کا اور کتنا کلام ہے جسے وہ کتابی صُورت میں چھپوانا چاہتے ہوں۔ میں نے کہا کہ ''گنجِ معانی'' کے علاوہ چار مجموعے اور مرتب ہو چکے ہیں۔ ''نیرنگِ معانی''، ''رُباعیاتِ محروم''، ''بچوں کی دُنیا'' اور ''بہارِ طفلی''۔ تو اُنھوں نے چاروں کے لئے کچھ سبسڈی منظور کی جو مجھے مل گئی۔ لیکن سبسڈی سے کتابیں مکمل طور پر تو نہیں چھپ سکتی تھیں۔ میں نے یہ صورتِ حال حکیم عبدالحمید سے بیان کی۔ انھوں نے باقی ماندہ رقم اپنی جیب سے ادا کر دی اور یہ چاروں کتابیں چھپ گئیں۔

یہ مقالہ میں جناب محمد صہیب قریشی کی فرمائش پر ہفت روزہ ''ندائے مِلّت'' لکھنؤ کے حکیم عبدالحمید نمبر کے لئے لکھ رہا ہوں۔ اس خاص نمبر میں مجھے یقین ہے اکثر اہلِ قلم حکیم عبدالحمید کے اُن اداروں کا ذکر تفصیل سے کریں گے جو دہلی اور بیرونِ دہلی میں ان کے جاری کئے ہوئے چشمہ فیض کی بدولت خوش اسلوبی کے ساتھ چل رہے ہیں مثلاً غالب اکیڈمی، ہمدرد نیشنل یونیورسٹی، انگریزی کا سہ ماہی جریدہ Studies in Islam، ہمدرد ایجوکیشنل سوسائٹی جس کے نگران سیّد حامد ایسے ایڈمنسٹریٹر اور ماہرِ تعلیم ہیں، ہمدرد ریسرچ سنٹر اور دُوسرے کئی ادارے۔ اس لئے میں یہاں ان کی کرم گستری کا ایک اور واقعہ پیش کروں گا جو

میرے لئے ہی مختص تھا اور جس کا باللسان ذکر تو میں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اپنے احباب میں اکثر کر چکا ہوں۔ لیکن بالقلم شاید ابھی تک نہیں کر سکا۔

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا مدّت سے یہ طریق کار رہا ہے کہ انجمن کا جب کوئی عہدہ دار پچھتر برس کی عمر کا ہو جاتا ہے تو انجمن اس کے جلسہ اعزاز کی صورت میں ادبی سطح پر اُس کی ڈائمنڈ جوبلی مناتی ہے جس میں اس کے علمی اور ادبی کام پر مقالے پڑھے جاتے ہیں۔ حال ہی میں اس طرح کے جلسے انجمن کی جانب سے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور پروفیسر مسعود حسین کے اعزاز میں منعقد کئے جا چکے ہیں۔ جب میری عمر پچھتر برس کی ہو گئی تو ڈاکٹر خلیق انجم نے اس بات کا مجھ سے ذکر کیا اور بعض اور اراکین نے بھی جلسہ اعزاز کے انعقاد کی بات کی۔ لیکن میں چونکہ انجمن ترقی اردو (ہند) کا صدر ہوں اور اُس وقت بھی صدر تھا اس لئے انجمن کی جانب سے میرے اعزاز میں جلسے کا انعقاد مجھے کچھ مناسب نظر نہ آیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس طرح کے جلسہ اعزاز پر اخراجات کے لئے حامی بھرنا کوئی پسندیدہ فعل نہیں۔ چنانچہ مَیں نے ڈاکٹر خلیق انجم سے کہا کہ جب تک مَیں صدرِ انجمن ہوں، انجمن کا میرے لئے جلسہ اعزاز منعقد کرنا مناسب نہیں ہے۔

اُس وقت تو بات ختم ہو گئی لیکن اس بات کا ذکر ڈاکٹر خلیق انجم نے حکیم عبدالحمید صاحب سے کیا۔ حکیم صاحب قبلہ نے ساری بات سُن کر ڈاکٹر خلیق انجم سے کہا کہ آپ مطمئن رہیں۔ آزاد کے اعزاز میں یہ جلسہ اعزاز غالب اکیڈمی کی جانب سے منعقد کیا جائے گا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے قبلہ حکیم صاحب سے یہ بھی کہا کہ میں نے ''جگن ناتھ آزاد: حیات اور ادبی خدمات'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب کی ہے، اس کی رسمِ رُونمائی بھی اس جلسے میں آپ کے دستِ مبارک سے ہو تو جلسہ اعزاز کے وقار میں اضافہ ہو جائے گا۔ حکیم صاحب نے ڈاکٹر خلیق کی اس خواہش پر بھی صاد فرمایا اور یہ تقریب بھی تاریخ پیدائش سے ایک روز پہلے یعنی ۴ر دسمبر ۱۹۹۳ء کو جلسہ اعزاز کے ساتھ ہی غالب اکیڈمی (بستی حضرت خواجہ نظام الدین

اولیاؒ) میں منعقد ہوئی جس میں حکیم عبدالحمید صاحب ہمارے خصوصی مہمان کی حیثیت سے شریک ہوئے اور انھوں نے اپنے دستِ مبارک سے ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب ''جگن ناتھ آزاد: حیات اور ادبی خدمات'' کی رسمِ رُونمائی ادا فرمائی۔

اَب معلوم نہیں یہاں میرے لئے یہ کہنا مناسب ہے یا نہیں کہ اُس جلسہء اعزاز پر ہزاروں روپیہ خرچ ہوگیا ہوگا۔ صرف پھولوں کے ہار جو اُس موقع پر لائے گئے وہی کئی ہزار کی قیمت کے ہوں گے۔ اِس کے علاوہ دُوسرے انتظامات اور تمام مہمانوں کی پُر تکلف چائے سے تواضع پر بھی خاصا خرچ کیا گیا ہوگا۔ یوں تو یہ سامنے کی بات ہے اور ظاہر ہے کہ جب اِتنا بڑا جلسہ منعقد ہُوا ہوگا تو خرچ بھی ہزاروں تک پہنچا ہوگا۔ اِس لئے میرا یہ لکھنا آتا تو حشو و زوائد کی ذیل میں ہے لیکن میں چونکہ اُس جلسہء اعزاز کے لئے قبلہ حکیم صاحب کا تہِ دل سے شُکر گزار ہُوں اس لئے یہ چند الفاظ بے اختیار میری نوکِ قلم پر آگئے اور ساتھ ہی حکیم صاحب کے لئے یہ شعر بھی زبان پر آرہا ہے ؂

الٰہی بختِ تو بیدار بادا!

تُرا دولت ہمیشہ یار بادا!

عاشُور کاظمی

(برطانیہ میں ادب کی ترقی پسند تحریک کا علمبردار)

سیدؔ عاشور کاظمی کے نام اور کام سے تو مَیں ایک مدت سے واقف تھا لیکن اُن سے اوّلین ملاقات آج سے بارہ تیرہ برس قبل ہی ہوئی جب وہ انجمن ترقی پسند مصنفین برطانیہ کی گولڈن جوبلی کی تقریبات میں ہندوستان کے اہلِ قلم حضرات کو دعوت دینے دہلی آئے۔ میرے عزیز دوست ڈاکٹر قمر رئیس اپنے ایک خط میں چند روز قبل مذکورہ گولڈن جوبلی کی اطلاع مُجھے دے چکے تھے اور اس سلسلے میں گفت وشنید کا سلسلہ چونکہ چل رہا تھا اس لیے اِس اطلاع کے ساتھ ہی اُنھوں نے مجھے لکھا کہ اگر ممکن ہو تو آپ بھی چند روز کے لیے دہلی آجائیں تا کہ بعض اہم امور پر بات ہو سکے۔ چنانچہ میں بھی اُن دنوں دہلی پہنچ گیا اور انجمن ترقی اُردو (ہند) کے دفتر یعنی اُردو گھر میں عاشور صاحب کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ اسی پہلی ملاقات ہی میں مُجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان کے ساتھ مدّت سے ملاقات چلی آرہی ہے۔ اُنھوں نے مُجھے بھی لندن آنے کی دعوت دی اور میں نے بھی پختہ وعدہ کرلیا۔

میں واپس جموں پہنچا تو چند روز میں عاشور صاحب کی طرف سے ایک باضابطہ دعوت نامہ بھی موصول ہوگیا۔ میں بھی چونکہ اس سفر کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس لیے ڈاکٹر قمر رئیس کو میں نے لکھا کہ گولڈن جوبلی کی تقریب میں شرکت کے لیے آپ جس تاریخ کو لندن جا رہے ہوں اُسی تاریخ کے لیے ایرلائنز کے دفتر میں میرا نام بھی اپنے نام کے ساتھ لکھوا دیں۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے میرا ابھی پختہ ارادہ ہے۔ چنانچہ قمر رئیس نے ایرلائنز کے دفتر میں میرا بھی نام درج کرا دیا لیکن نہ جانے عین وقت پر کیا مصروفیت پیش آ گئی کہ میں اس کانفرنس میں شرکت کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ عین وقت کے وقت قمر رئیس صاحب سے ٹیلی فون پر معذرت کر لی اور اسپیڈ پوسٹ کے ذریعے سے خط لکھ کر عاشور کاظمی صاحب سے بھی۔ لیکن گولڈن جوبلی کی تقاریب میں شریک نہ ہونے کا جو افسوس مُجھے ہوا لفظوں میں نہیں آ سکتا۔

کچھ عرصہ بعد ''نیا سفر'' میں یا کسی اور معیاری جریدے میں علی احمد فاطمی کی لکھی ہوئی اُس کانفرنس کی مفصّل (غالبًا سلسلہ وار) رُوداد میں نے پڑھی۔ رُوداد کیا تھی ایک full length فلم تھی جس نے اس کانفرنس کے بارے میں سب کچھ (اور اگر سب کچھ نہیں تو بہت کچھ) بتا دیا لیکن اسے پڑھ کے مُجھے پھر اُتنا ہی دُکھ ہوا جتنا کانفرنس میں شریک نہ ہونے کا ہوا تھا کہ اِتنی معیاری کانفرنس اور میں اِس سے غیر حاضر رہا۔ علی احمد فاطمی کی رپورٹ کا یہ پہلو ہمیشہ مُجھے اس محرومی کی یاد دلاتا رہے گا کہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین (برطانیہ) کی گولڈن جوبلی تقاریب میں شریک نہ ہو سکا اور برطانیہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین جو کام کر رہی ہے اسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکا۔

باہر کے ملکوں میں جو لوگ اُردو کے لیے کام کر رہے ہیں وہ حقیقتًا ایک لبریز مشکلات ماحول میں سرگرمِ عمل ہیں۔ وہ برمنگھم کے ڈاکٹر سعید اختر دُرّانی ہوں یا عبداللہ وہاب یا ڈاکٹر حسنی یا مروّت حُسین' لندن کے عاشور کاظمی ہوں یا بخش لائل پوری یا رضا

عابدی یا بریڈفورڈ کے صفات علوی یا مختار الدین احمد' شکاگو کے افتخار نسیم ہوں، کینیڈا کے اشفاق حسین یا بیدار بخت یا حفظ الکبیر یا کرنل انوار احمد' ناروے کے جمشید مسرور ہوں یا ہرچرن چاولہ' سویڈن کے جمیل احسن ہوں یا ڈنمارک کے شمشیر سنگھ شیر یا نصر ملک' اُن کی مُشکلات وہی جانتے ہیں جو اپنی آنکھوں سے مغربی دُنیا کی صورتِ حال دیکھ آئے ہیں۔ اور پھر ان میں جو ادب کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں اُن کے لیے تو حالات اور زیادہ ناسازگار ہیں۔ عاشور کاظمی کا تعلق اسی نقطۂ نگاہ کے اہلِ قلم سے ہے جو آج بھی ادب کی ترقی پسند تحریک کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور جتنی بڑی بین الاقوامی کانفرنس عاشور کاظمی نے ترقی پسند تحریک کے پرچم تلے منعقد کی وہ تاریخِ ادبِ اُردو کے ایک اہم باب کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس سے اگلے برس میں بریڈفورڈ کی انٹرنیشنل اُردو کانفرنس میں شرکت کے لیے برطانیہ گیا۔ یہ کانفرنس صفات علوی، مختار الدین احمد اور اُن کے احباب کی کاوشوں کا نتیجہ تھی۔ اِس سفر میں لندن میں بھی چند روز کے لیے میرا قیام رہا لیکن عاشور کاظمی سے خواہش کے باوجود ملاقات نہ ہو سکی جس کا مجھے دِلی افسوس رہا' کیونکہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اُردو کی اِس محبوب شخصیت سے ملنا جو بہ یک وقت مجاہدِ اُردو بھی ہے اور تخلیقی فن کار بھی' خوش نصیبی کی بات ہے۔

تیسرے برس پھر برمنگھم کا سفر تھا۔ میرے عزیز دوست پروفیسر سعید اختر دُرّانی نے کچھ مدّت قبل وہاں اقبال اکیڈیمی کا جو پودا لگایا تھا وہ اُس وقت تک ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ (اور آج تو یہ ایک ایسا چنار ہے جس کی چھاؤں دُور دُور تک پہنچ رہی ہے) جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں اُس وقت پروفیسر دُرّانی نے مُجھے برمنگھم آنے کی دعوت دی' اقبال اکیڈیمی کی تقاریب کے لیے۔ تقاریب کے دو حصّے تھے۔ ایک تو تھا علامہ اِقبال کے فکر و فن پر میرا لیکچر عبداللہ وہاب صاحب کی زیرِ صدارت اور دُوسرا تھا مشاعرہ، جس کی صدارت ڈاکٹر

ڈرّانی نے میرے سپرد کی۔ وہاں عاشور صاحب سے مفصل ملاقات رہی۔ وہ میرے لیکچر
میں بھی تشریف فرما تھے اور مشاعرے میں تو وہ بھرپور طریقے سے شریک تھے۔ مشاعرے میں
اُنھیں میں نے پہلی بار سُنا۔ اُن کا کلام تو بہت خوب ہے ہی یہ میں پہلے سے جانتا تھا اب دیکھا
کہ اُن کے پڑھنے کا انداز بھی بہت موثر ہے۔

اس کے کچھ مدّت بعد لندن کے ایک اور سفر میں اُن کے ساتھ بالتفصیل ملاقات
ہوئی۔ اُن کے گھر میں۔ اب اِتنا تو یاد ہے کہ وہ ملاقات لندن کے ایک مشاعرے میں ہوئی
لیکن یہ پوری طرح سے یاد نہیں آرہا ہے کہ وہ مشاعرہ کس مقام پر تھا والتھم اسٹو میں یا
ومبلڈن میں۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو میں نے عاشور صاحب سے کہا کہ آپ کے گھر جانے کا
اتفاق آج تک نہیں ہوا۔ ہندوستان واپس جانے سے قبل آپ کے گھر مجھے آنا چاہیے۔
اُنھوں نے کہا ''ابھی چلیے'' میں نے کہا کہ اب تو رات کے (یا صبح کے) دو بجنے کو ہیں۔ میں
اپنے برادرِ نسبتی سبھاش کے گھر میں مقیم تھا' وہ میرے ساتھ تھے۔ اُن سے میں نے بات کی۔
اُنھوں نے عاشور کے مکان کا پتا پوچھا۔ معلوم ہوا کہ عاشور صاحب کا مکان میری قیام گاہ
یعنی سبھاش کے گھر کے رستے میں ہے۔ چنانچہ اُسی وقت اُن کے گھر جانے کا فیصلہ ہوگیا۔
اب آگے آگے عاشور کاظمی کی گاڑی اور پیچھے ہماری گاڑی۔ ان کے گھر پہنچے۔ اُن کی ذاتی
لائبریری دیکھی' جی خوش ہوگیا۔ وہاں جاکے انجمن ترقی پسند مصنفین برطانیہ کے کام کے ایک
پہلو کا خاصا اندازہ ہوا اور وہ ہے انجمن کے زیرِ اہتمام علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت۔ ان
میں فارغ بخاری کی کتابیں بھی تھیں، بخش لائل پوری کی بھی اور ان کی اپنی بھی۔ میں اِن
کتابوں کی ایک جھلک دیکھ کر دلی طور پر مسرور ہوا۔

عاشور کے ساتھ تازہ ترین ملاقات حال ہی میں ہوئی چند ماہ قبل۔ اب کے برمنگھم میں
یونیورسٹی آف برمنگھم کے تعاون سے اقبال اکیڈمی برطانیہ کے زیرِ اہتمام Iqbal and the
Fine Arts: Heritage of Islamic Creativity کے زیرِ عنوان ایک انٹرنیشنل کانفرنس منعقد ہوئی۔

پروفیسر سعید اختر دُرّانی نے دعوت نامہ بھیجنے کے ساتھ ہی مجھ سے فرمائش کی کہ میں Aethetics
in Iqbal's Poetry کے موضوع پر کلیدی خطبہ لکھوں۔ میں نے کلیدی خطبہ لکھ کے اُنھیں بھیج دیا
اور جس روز کانفرنس شروع ہونا تھا اُسی روز ماسکو اور لندن سے ہوتا ہوا میں برمنگھم پہنچ گیا۔
اُدھر سے عاشور کاظمی بھی برمنگھم پہنچ گئے۔ جب وہ سیشن ختم ہوا جس میں اپنا کلیدی خطبہ میں
نے پیش کیا اور کافی کے وقفے کے لیے ہم سب ملحقہ ہال میں جمع ہوئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ
عاشور کاظمی اور شبانہ سامنے کھڑے ہیں۔ عاشور نے ملتے ہی سوال کیا اب بتایئے کیا پروگرام
ہے۔ میں نے کہا کہ میں کل ہی کانفرنس کی مہمان نوازی ختم ہوتے ہی کارپر فیلڈ ہوٹل سے
چلا جاؤں گا اور اس کے بعد ایک دن مزید برمنگھم میں قیام کرکے اپنی بیٹی سے ملنے فرڈوشم
جانے کا پروگرام ہے۔ کہنے لگے منتظمین کی مہمان نوازی کے بعد والا دن کہاں گزارنے کا
ارادہ ہے۔ میں نے کہا ابھی سوچا نہیں۔ بولے مجھے معلوم تھا کہ تمام ڈیلی گیٹ پرسوں رات
تک ہوٹل خالی کررہے ہیں۔ اِس کے بعد ایک دن' دو دن' تین دن' چار دن' جتنے دن آپ
رُکنا چاہیں آپ میرے مہمان ہیں اور میں نے آپ کی پروونشل بکنگ برمنگھم کے فلاں گیسٹ
ہاؤس میں کرادی ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی اور میں نے کہا کہ منتظمین نے بعض ڈیلی گیٹوں
کو مہمان نوازی کی آخری تاریخ سے مطلع کردیا ہے لیکن مجھ سے کسی نے ابھی تک آخری
تاریخ کی بات نہیں کی۔ ویسے میرے کان میں یہ بات پڑی ہے کہ منتظمین تمام ڈیلیگیٹوں کے
چلے جانے کے بعد ایک شام میرے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں۔ منتظمین سب یا زیادہ تر برطانیہ
میں آباد پاکستانی ہیں۔ ممکن ہے ان میں کوئی ہندوستانی بھی ہو۔ اب یہ حضرات انگریزی کے
تین چار دن کے پروگرام کے بعد منھ کا مزہ بدلنے کے لیے شاید اُردو شعروشاعری سے
لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں اس لیے آپ فی الحال گیسٹ ہاؤس کی بکنگ کینسل کرادیں۔
کہنے لگے کینسل کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ جس وقت اور جتنے دن کے لیے یہاں
رہنا چاہیں مجھے ٹیلی فون کردیں، میں گاڑی لے کر آؤں گا اور آپ کو گیسٹ ہاؤس لے جاؤں
گا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور یہ کہہ کر ہامی بھری کہ اگر منتظمین نے مجھ سے ہوٹل خالی کرنے

کے لیے نہ کہا تو میں ایک دن اسی ہوٹل ہی میں رہوں گا۔ یہ بات تو یہیں ختم ہوگئی۔ شبانہ ان کے ساتھ تھیں۔ اُنھوں نے X L Radio میں انٹرویو کی مجھے دعوت دی اور پوچھا کہ کل میں گاڑی لے کے کہاں آؤں۔ میں نے کہا مجھے اپنا کل کے دن کا پروگرام معلوم نہیں لیکن آپ مُجھے انٹرویو کے وقت سے آگاہ کر دیں میں آپ کے ریڈیو اسٹیشن پر پہنچ جاؤں گا۔ اب اتفاق کی بات ہے کہ عزیزِ محترم مروّت حسین نے میرے کہنے پر دُوسرے دن محمود ہاشمی سے میری ملاقات کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ جب میں نے اُن سے X L Radio کا ذکر کیا تو اُنھوں نے کہا کہ جب ہم محمود ہاشمی کو لے کے آئیں گے تو رستے میں XL Radio کا انٹرویو ریکارڈ کرا لیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ تھا تو ایک live broadcast لیکن میرے لیے اپنی قسم کا پہلا live broadcast جس میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اشتہارات بھی دیے جا رہے تھے اور میرے ساتھ انٹرویو کا سلسلہ جہاں ٹوٹتا تھا وہیں سے دوبارہ انٹرویو کا باقی حصہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس طرح کے live broadcast کا تجربہ مُجھے نہ امریکا میں ہوا تھا نہ سوویت یونین میں، نہ کینیڈا اور لٹویا میں یا یورپ اور برطانیہ یا پاکستان اور ہندوستان کے کسی ریڈیو اسٹیشن پر۔ بہرطور بقول اقبالؔ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

تو میں عاشور کاظمی کی بات کر رہا تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ کانفرنس کے پہلے سیشن کی کارروائی تو آپ نے دیکھ سُن لی۔ اب دُوسرے سیشن کے لیے بھی رُکیے۔ کہنے لگے اس وقت میں اور شبانہ ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے ایک اور شہر جا رہے ہیں۔ (اُنھوں نے شہر کا نام تو بتایا تھا لیکن مُجھے یاد نہیں رہا) اور بہت جلدی میں ہیں۔ صرف آج کا key note ایڈریس سننے یہاں آگئے ہیں۔ اب اِنشا اللہ کل X L Radio میں ملاقات ہوگی۔ اور میں بھی آپ کا انٹرویو لینے والوں میں شامل ہوں۔

یہ کہہ کے عاشور اور شبانہ مشاعرے میں شرکت کرنے چلے گئے۔ دُوسرے دن جب

میں محمود ہاشمی صاحب اور مروّت حسین صاحب کے ساتھ X L Radio پہنچا تو شبانہ کو اپنا منتظر پایا۔ اب ہم چاروں کو سیّد عاشور کاظمی کا انتظار تھا۔ شبانہ نے دو چار جگہوں پر ٹیلی فون بھی کیا۔ عاشور صاحب نہ جانے کہاں مصروف ہو گئے تھے کہ اُس وقت اُن کا پتا نہ چل سکا۔ دراصل خدا کے فضل و کرم سے ان کا کاروبار اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اُن کی مصروفیات انھیں ہر وقت رواں دواں رکھتی ہیں۔ بہرطور انٹرویو شروع بھی ہوا اور ختم بھی ہو گیا لیکن عاشور کاظمی صاحب کے بغیر۔ چنانچہ میں اُن کے لیے ایک پُرزے پر لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازیؒ کا یہ شعر لکھ کر شبانہ کو دے کے آگیا

کشتی شکستگانیم اے بادِ شُرطہ برخیز
باشد کہ باز بینیم آں یارِ آشنا را

(۹راگست ۹۶ء - حیدرآباد سے کڑپا جاتے ہوئے)

بمبئی کی بزم آرائیاں

رفعت سروش ——— اس نام کی کئی جہتیں ہیں، شاعر، نثار، تمثیل نگار، شخصیت نگار، سوانح نگار ——— اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ——— اور ان سب سے زیادہ اہم جہت ہے ایک دل کش شخصیت کی جس نے اپنے اظہار کے لیے نظم و نثر کے دل کش پیرائے اختیار کیے۔

شاعری تو خیر آج کے دور میں 'وزن' کی ضرورت سے بے نیاز ہو گئی ہے لیکن نثر 'وزن' کی ضرورت سے بے نیاز نہیں ہوئی۔ اور میرا تو شروع سے یہ خیال ہے کہ نظم میں وزن برقرار رکھنا بڑی بات نہیں ہے، نثر میں وزن برقرار رکھنا بڑی بات ہے۔ رفعت سروش کی نثر میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم نظر آتی ہے اور پروفیسر انور صدیقی نے جب یہ لکھا تھا کہ "رفعت سروش کی تخلیقی فعالیت کی جہتیں کچھ اتنی متنوع ہیں کہ ان کی کاوشوں کو نظر انداز کرنا ہماری ادبی تنقید کی ایک ایسی مجرمانہ غفلت ہے جسے کم از کم میں معاف کرنے کو تیار نہیں ہوں۔" تو وہ غالباً اس بات کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ تنقید نگاروں نے رفعت سروش کی نثر نگاری کو جس کے کئی ابعاد ہیں قطعاً نظر انداز کیا ہے۔ ان کی شاعری کو تو نقادوں نے جی بھر کے سراہا ہے اور یہاں تک کہ ان کی نثری تصنیف ——— بمبئی کی بزم آرائیاں ——— کے جلد پوش پر ہمارے نقاد حضرات کا جو اظہارِ خیال درج ہے اس میں سروش کی نثر نگاری کے متعلق ہلکا سا اشارہ بھی موجود نہیں۔ کتاب نثر کی ہے اور ہمارے نقاد حضرات ان کی شاعری کی تعریف فرما رہے ہیں ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خُدا!

غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ نثر کی کتاب پر رائے دیتے وقت اسے پڑھنا پڑتا ہے۔

اس وقت میرے سامنے یہی مذکورہ کتاب ہے "بمبئی کی بزم آرائیاں" اور میں نے اسے ابھی ختم کیا ہے۔ اوّل سے آخر تک اور یہ مجھے نثر نگاری کا ایک ایسا تصویر خانہ نظر آیا ہے جس کی مثالیں اُردو ادب میں کم ملتی ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کتاب کا طرزِ بیان اوّل سے آخر تک انتہائی دلکشی سے لبریز ہے۔ یہ نثر نگاری کی بنیادی خوبی ہے جسے readability کہتے ہیں۔ اور جو نثر نگاروں کے یہاں اکثر و بیشتر مفقود ہے۔

یہ کتاب جگ بیتی بھی ہے اور آپ بیتی بھی ہے اس میں کردار نگاری کے خوبصورت نمونے بھی ملتے ہیں اور منظر نگاری کے بھی۔ اس میں گہرا مشاہدہ بھی ہے اور نفسیاتی مطالعہ بھی۔ کہیں کہیں ایک آدھ شعر یا چند اشعار بھی ایسے آ جاتے ہیں جو انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ ایک ادبی نثر پارہ ہے جسے اُردو کا کوئی سچا اور کھرا محقق نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پیشہ ور نقادوں کی بات دوسری ہے۔

رفعت سروش کی یہ خود نوشت سوانح حیات ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۸ء تک محیط ہے۔ صرف تیرہ برس کی داستان لیکن اس میں بمبئی کی بزم آرائیوں کے ساتھ ہی ساتھ شاعر کا بطون آئینہ بن کر قاری کے سامنے آ گیا ہے۔ یہ ایک فعال ادیبانہ اور شاعرانہ زندگی کے تیرہ برس کی داستان ہے۔ اور میں "ادیبانہ اور شاعرانہ زندگی" پر اس لیے زور دے رہا ہوں کہ اس روداد میں رفعت سروش کے اندر کا سچا شاعر اور ادیب قدم قدم پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ بناوٹ اور تصنع سے بے نیاز،

خود ستائی سے بے گانہ ۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :

"غرض میں نے بمبئی پہنچنے کے بعد اپنی سطح پر فلمی حلقوں میں
گھسنے کی کوشش کی مگر شاید میں اس ماحول کے لیے ناپختہ تھا ۔
اور میں اس بھاگ دوڑ کو بے نتیجہ سمجھ کر شرافت سے اپنے پرانے
پیشے کلرکی کی طرف متوجہ ہوا اور مواقع تلاش کرنے لگا ۔"

یہ حق گوئی اور بے باکی ایک سچے اور کھرے فن کار ہی کی متاعِ حیات ہو سکتی ہے ورنہ رفعت سروش بھی اردو کے بعض ان شعرا کی طرح جو چور دروازے سے فلم انڈسٹری میں داخل ہوئے اور ناکام ہو کر وہاں سے واپس تشریف لائے ساری انڈسٹری کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنا سکتے تھے ۔

○

میرا خیال تھا کہ رفعت سروش کے ساتھ میرے چالیس پینتالیس برس کے مراسم ہیں اور میں ان کے بارے میں سب کچھ یا کم از کم بہت کچھ جانتا ہوں لیکن یہ کتاب پڑھی تو پتہ چلا کہ میں ان کے بارے میں بہت ہی کم جانتا ہوں ۔ رفعت تو اس کتاب کی گہرائی میں پوشیدہ ہے ۔ زندگی کے کارزار میں آگے بڑھنے کے لیے رفعت سروش کو کس قدر جدّ و جہد کرنا پڑی گی اور یہ کس قدر دشوار گزار راستوں سے گزرا اس کا مجھے اندازہ نہ تھا اور یہ اسی جدّ و جہد کا نتیجہ ہے کہ آج رفعت سروش علمی ، ادبی اور سماجی دنیا میں جس مقام پر فائز ہے وہاں تک کوئی ایسا اہلِ قلم نہیں پہنچ سکتا جس نے علم و ادب کو محض سرسری (casual) انداز سے برتا ہو ۔ اور یہ اسی جدّ و جہد کا فیض ہے کہ رفعت سروش کو شروع ہی میں تلاشِ علم و فن اور تلاشِ روزگار کے رستے پر ایسے رفیق ملتے چلے گئے جو علم و فن کے جادے پر اس وقت ننھے ننھے چراغوں کی حیثیت رکھتے تھے لیکن آج مسلّمہ طور پر وہ ہمارے لیے روشنی کے میناروں کا کام دے رہے ہیں اور ہم لوگوں کے لیے یہ بات باعثِ فخر ہے کہ ہم اس وقت ان میناروں کی روشنی میں اپنا راستہ اور اپنی منزل تلاش کرنے میں مصروف ہیں ۔ روشنی کے ان میناروں میں سے کس کس کا ذکر کیا جائے ۔ بنّے بھائی ، مجاز ، یوسف ظفر ، ضیا جالندھری ، ممتاز مفتی ، میرا جی ، سعادت حسن منٹو ، ساحر لدھیانوی ، اوپندر ناتھ اشک ،

پریم ساگر گپتا ، رمیش چندر ، سبطِ حسن ، کرشن چندر ، دانیال لطیفی ، فراق گورکھپوری ، احتشام حسین ، جوش ملیح آبادی ، صمد شاہین ، ممتاز شیریں ، قاضی عبدالغفار ، مخدوم محی الدین ، ابراہیم جلیس ، نیاز حیدر ، نظر حیدر آبادی ، ساحر لدھیانوی ، جاں نثار اختر ، مولانا حسرت موہانی ، ڈاکٹر عبدالعلیم ، پرویز شاہدی اور نہ جانے کتنے ہی اور ــــــــ

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم !
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

اور رفعت سروش خوش نصیب ہیں کہ انھیں اپنے کیریر کی ابتدا ہی میں آسمانِ ادب کے ان چاند تاروں کی رفاقت و صحبت نصیب ہوئی ۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

○

۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۸ء تک ہماری ترقی پسند تحریک کن راستوں سے اور کن موڑوں سے گزری اس کا ایک خوبصورت بیان "بمبئی کی بزم آرائیاں" میں ملتا ہے ۔ یہ خوبصورت بیان تاریخ کا ایک ورق ہے اور فکشن سے زیادہ دل چسپی اپنے اندر رکھتا ہے ۔ یہ اخباری رپورتاژ نہیں ہے کسی سیاسی لیڈر کے بیانات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک ادب پارہ ہے جو ایک تخلیقی فن کار کے مشاہدات و تجربات زندگی کا نچوڑ ہے ۔

○

جس زمانے کی یہ داستان ہے اس زمانے میں راقم الحروف کی سکونت راولپنڈی ، لاہور اور دہلی میں رہی اس لیے میں اس دور میں مذکورہ بالا برگزیدہ ہستیوں میں سے اکثر کی ملاقاتوں سے محروم رہا ۔ لیکن بابا عالم سیاہ پوش ، میرا جی ، ن ۔ م ۔ راشد اور نفیس خلیلی کا ذکر پڑھ کر میری لاہور اور راولپنڈی کی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں اور بمبئی کی بزم آرائیوں کے بہانے مجھے ایک بار پھر اپنے ماضی میں لمبا سفر کرنے کا موقع مل گیا ۔ یہ اس کتاب کا ایک ایسا پہلو ہے جس کا فیض شاید ہر قاری تک نہ پہنچ سکے لیکن میں اس سے فیض یاب بھی ہوا ہوں اور سرشار بھی ۔

دراصل یہ کرشمہ مصنف کی نثر نگاری کی اُس خصوصیت کا ہے جو ادب کی جانب اور اپنی ذات کی جانب ایک مخلصانہ رویہ رکھنے سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی جھلک زیرِ نظر کتاب میں اوّل سے آخر تک پائی جاتی ہے اگرچہ اس کے ابعاد ہر جگہ مختلف ہیں کہیں یہ اُس انتساب میں نظر آتی ہے جو سیّد ذوالفقار علی بخاری (مرحوم) کے نام کیا گیا ہے۔ کہیں پطرس بخاری مرحوم کے ذکر میں، کہیں امتیاز بھائی اور بھوانی پرشاد مشیر کے تعلق سے اور کہیں مہاتما گاندھی کے قتل ہونے پر۔ گاندھی جی کے حادثۂ قتل پر رفعت سروش کا تاثر دیکھیے:

گاندھی جی کا قتل (آزادی کے بعد) اسی ملک میں تشدد کا پہلا مظاہرہ تھا اور یہ حربہ سب سے پہلے اس انسان پر آزمایا گیا جو عدم تشدد کی تلقین کرتا تھا اور اس یقین اور اعتماد کے ساتھ تشدد، قتل و غارت اور فسادات کی دہکتی ہوئی آگ میں کود جاتا تھا کہ اس کی جرأت اس آگ کو ٹھنڈا کر دے گی ——— اور بہت بار ایسا ہوا بھی ——— مگر نفرت کا لاوا اندر ہی اندر سُلگ رہا تھا اور اس لاوے کی پوری شدت بارود بن کر گوڈسے کے ریوالور میں آگئی ——— اور ان گولیوں نے اُس سینے کو چھلنی کر دیا جس سے امن و انسانیت کے نغمے پھوٹتے تھے اور اس آواز کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا جس میں بچوں کی سی معصومیت اور سچائی کی طرح سچائی تھی۔

○

بمبئی ریڈیو کے تذکرے اور اس اسٹیشن پر رونما ہونے والے چھوٹے بڑے واقعات کتاب پڑھتے وقت اس طرح میری نظر میں پھر گئے جیسے میں خود اس ریڈیو اسٹیشن کو اندر اور باہر سے دیکھ رہا ہوں۔

جس زمانے میں ادب کی ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی اور بمبئی میں اس کے معرکہ آرا اجلاس ہوتے تھے، میں حکومتِ ہند کی ملازمت میں مقید تھا۔ اس زمانے میں اکثر یہ خواہش ہوتی تھی کہ کبھی میں جا کر ان اجلاسوں میں شرکت کروں۔ اگر بات چیت میں حصہ نہ لے سکوں تو کم از کم ایک سامع کے طور ہی پر سہی لیکن وہ لمحہ سعید میسّر نہ آیا اور یہ خواہش دل ہی میں رہ گئی۔ لیکن اب اس

کتاب میں انجمن کے اکثر اجلاسوں کی روداد یں اپنے متعدد ابعاد کے ساتھ سامنے آگئیں جتنا کچھ اس کتاب نے کھول کے بیان کر دیا اتنا کچھ میں دو ایک جلسوں میں اگر وہ میسّر آ بھی جاتے تو کیسے دیکھ سکتا تھا۔

○

بمبئی کی بزم آرائیوں میں رفعت سروش کے فکر و نظر کا ایک اور اہم پہلو سامنے آتا ہے جس سے میں ابھی تک بے خبر تھا اور وہ ہے رفعت کا تنقیدی شعور، اگرچہ ایک خود نوشت سوانح حیات میں جو آپ بیتی کے علاوہ جگ بیتی کا پہلو بھی لیے ہوئے ہو ادبی تنقید نگاری کی گنجائش نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے لیکن ایک دانش ور اپنے ماحول پر محض ایک طائرانہ نظر ڈال کر نہیں گزر جاتا بلکہ اس کا تنقیدی شعور ہمیشہ عالمِ بیداری میں رہتا ہے اور رفعت سروش کے تنقیدی شعور کی جھلکیاں اس کتاب میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ جاں نثار اختر کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جاں نثار اختر بھی "مقصدیت زدہ" ادب کا شکار ہوئے اور بہت دن تک ایسی سپاٹ نظمیں کہتے رہے جو ان کے اپنے رنگ و آہنگ سے مطابقت نہ رکھتی تھیں اور جن پر وہ "راہِ راست" پر آنے کے بعد شرماتے ضرور ہوں گے۔ کیونکہ صفیہ کے انتقال کے بعد جاں نثار اختر کی شاعری کا نیا جنم ہوا۔ اور ان کی دل میں اُتر جانے والی نظمیں اور غزلیں "خاکِ دل" اور "پچھلا پہر" میں شائع ہوئیں جن کے ذریعے جاں نثار اختر نے اپنی بازیافت کی ——— ورنہ پہلے مجموعۂ کلام "سلاسل" کے بعد ان کا مجموعہ "جاوداں" بہت کمزور اور وقتی قسم کی نظموں پر مشتمل ہے۔"

سردار جعفری کی طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" کے بارے میں لکھتے ہیں:

سردار جعفری کی جس کتاب نے ایک گروہ (یعنی ترقی پسند) کے ناقدین کو اپنی طرف متوجہ کیا وہ ان کی طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" ہے جس میں سردار نے روایتی شاعری کی ڈگر سے ہٹ کر آزاد نظم کی تکنیک کو برتا۔ اگرچہ

"نئی دنیا کو سلام" کی آزاد شاعری میں راشد کی شاعری جیسا سحر انگیز
آہنگ اور تہ داری تو نہیں ہے مگر ایک شکوہ ہے اور کلماتی قوت ہے
جو سردار جعفری کے شعری آہنگ کو ممیز کرتی ہے۔

سردار جعفری کی شاعری کے اس جائزے کے ساتھ ہی ساتھ سردار جعفری کی شخصیت
کا ذکر اس کتاب میں کئی جگہوں پر آیا ہے اور اس ضمن میں رفعت سروش سے میرا اختلاف رائے
یہ ہے کہ جماعت فرد سے بڑی ہوتی ہے۔ اگر ہم آپ ایک ہی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور اس جماعت کے کسی رکن کے
طور طریقوں سے متفق نہیں ہیں اور انھیں ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں تو اس کے خلاف کچھ لکھنے سے قبل یہ سوچ لینا بہت
ضروری ہے کہ اس تحریر کا بحیثیت مجموعی جماعت یا تحریک پر کیا اثر پڑے گا۔ ہو سکتا ہے
میرا خیال غلط ہو لیکن میں "وفاداری بشرطِ استواری" "جز وِ ایماں" کا قائل ہوں اور اس
نظریے کا قائل ہوں کہ ایسی کسی بات کو نوکِ قلم پر لانا مناسب نہیں ہے جس سے جماعت یا
تحریک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ یہاں یہ مسئلہ زیرِ بحث نہیں ہے کہ رفعت نے
سردار جعفری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے یا غلط صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ
کتاب میں یہ لکھنا کہ "غرض سردار کے ہاتھ میں انجمن کی زمام آتے ہی اس کے رنگ ڈھنگ
بدلنے لگے اور آہستہ آہستہ وسیع النظری اور ادبی رواداری میں کمی آنی شروع ہو گئی"
یا "آزادی کے کچھ ماہ بعد علی سردار جعفری انجمن کے سربراہ بن گئے جسے انھوں نے شخصیت سازی
کے لیے استعمال کیا" لکھنے کی بات نہیں ہے بلکہ نہ لکھنے کی بات ہے۔ آج کا دور انجمن ترقی پسند
مصنفین کے عروج کا نہ سہی لیکن انجمن آج بھی زندہ ہے اور ایک فعال جماعت کے طور پر
کام کر رہی ہے۔ انجمن کو فعال بنانے میں اور اس کے لیے علمی اور ادبی سطح پر کام کرنے میں اور
اس کے لیے قربانیاں دینے میں علی سردار جعفری کے کام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر
وہ نظم جو اس طرح شروع ہوتی ہے:

نام پہ غریبی کے
چل گئی دکاں تیری
اور آج محفل میں

داد عیش دیتا ہے
پی کے جام نخوت کے
بھوک اور بغاوت پر
شعر ڈھال دیتا ہے

اور جس کے ایک حصے میں یہ مصرعے آتے ہیں:

انقلاب آئے گا
اور تیرے چہرے سے
یہ نقاب الٹ دے گا
تجھ سا بے عمل شاعر
زندگی کا دشمن ہے
تجھ سا بے عمل شاعر
آدمی کا دشمن ہے

اگر کسی وقت کہی گئی ہے تو دوسری بات ہے اور اسے کتاب میں شامل کرنا بالکل ہی اور
بات ہے۔ سردار جعفری آج بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کے امیرِ کارواں ہیں، انجمن میں
آج بھی ہماری نسل کے بعد کے اہلِ قلم شریک ہیں اور اس کے بعد کی نسل کے اہلِ قلم شریک ہو
رہے ہیں۔ ان کے سامنے اس طرح کے خیالات کا آنا کہ ہماری نسل کے اہلِ قلم ایک دوسرے
کے خلاف لکھنے میں اس حد تک بھی جا سکتے تھے انجمن کے مستقبل کے لیے مفید نہیں ہے
یہ بات اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ رفعت صاحب اسی کتاب میں خود ایک جگہ لکھتے ہیں:

"فراق اور سردار کے قضیے نے ترقی پسند مصنفین کی ساکھ کو
بہت نقصان پہنچایا۔"

تو گویا بات تو یہاں تک پہنچتی ہے کہ

ع من نہ کردم شما حذر بکنید!

اس نظم کا ذکر کرتے ہوئے رفعت سروش نے سردار جعفری کا ایک شعر نقل کیا ہے:

حکایتیں بھی بہت ہیں شکایتیں بھی بہت
مزا جب ہے کہ یاروں کے رُو بہ رُو کہیے!

لیکن یاروں کے رُو بہ رُو بات کرنا یا ان کے سامنے نظم پڑھنے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ نظم کو کتاب میں شامل کرکے اس طرح کی تلخ یادوں کو نئی نسل تک پہنچایا جائے اور ان یادوں کو ایک مستقل صورت دی جائے۔

○

آخر میں کتاب کے ایک بہت ہی دلچسپ اور بہت ہی اہم حصّے کی طرف اشارہ کرکے میں اس بات چیت کو ختم کرتا ہوں اگرچہ کتاب اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کے محاسن پر اور زیادہ لکھا جائے۔

ہر شخص کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے جس کا تجزیہ انسان خود نہیں کرسکتا۔ لیکن اگر کوئی مصنّف ایک واقعہ بلا کم و کاست بیان کردے تو قاری یا سامع کو اس کے مزاج کو پہچاننا آسان ہوجاتا ہے۔ رفعت سروش نے اس کتاب میں کئی بار اپنی ایک ایسی عادت اور مزاج کے ایک ایسے پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے ان کا جذبۂ خودداری روزِ روشن کی طرح ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ آج ادیب اور شاعر کے یہاں اسی جذبے کا خاصی حد تک فقدان نظر آتا ہے اور اگر کسی اہلِ قلم کے یہاں اس جذبے کی فراوانی نظر آئے تو یہ صرف اس کے لیے ہی فخر کی بات نہیں ہے بلکہ تمام اہلِ قلم کے لیے باعثِ افتخار ہے۔ اس ضمن میں چند ایک واقعات دیکھیے:

○

اگلے دن بھائی جان مجھے اپنے ساتھ اپنی دکان پر لے گئے اور چراغ دین کے چھوٹے بھائی چراغ دین اینڈ برادرز کے مالک سے میری ملازمت کے بارے میں بات کی۔ وہ فوراً راضی ہوگئے اور مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ چراغ دین اینڈ برادرز اپالو بندر لینڈن ہاؤس کے کونے والی دکان تھی۔ بھائی جان تو مجھے

مالک دکان کے سپرد کرکے اپنے کام پر چلے گئے مگر اس بندۂ خدا نے مجھے صبح سے شام تک بٹھائے رکھا۔ میں نے ایک دو بار کہا کہ مجھے کام بتائیے تو اس نے کہہ دیا کہ بیٹھے رہیے ـــــ مجھے اس دکان دار کا یہ رویہ تضحیک آمیز لگا اور میں نے شام کو بھائی جان سے کہہ دیا کہ میں اس دکان پر کام نہیں کرسکتا۔ خاص طور پر اس لیے کہ آپ ان لوگوں کے ساتھ ایک عرصے سے کام کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے آپ لوگوں کے تعلقات خراب ہوجائیں۔ بھائی جان نے اصرار نہیں کیا۔ اور اگلے دن سے میں اس اجنبی شہر میں تلاشِ معاش میں سرگرداں ہوگیا۔

(۲)

ایک ہی ایکسٹر تھے خواجہ صابر۔ وہ ایک رسالہ "تمثیل" نکالتے تھے۔ ان سے میری خط و کتابت تھی۔ میں سب سے پہلے وِنسنٹ روڈ (دادر) ان سے ملنے گیا بڑے اخلاق سے ملے اور جب معلوم ہوا کہ میں بے کار ہوں تو اپنے رسالے میں کام کرنے کی دعوت دی اور مجھے "تمثیل" کا ایڈیٹر مقرر کردیا گیا۔ ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ طے ہوئی۔ میں نے "تمثیل" کے عید نمبر کی تیاریاں شروع کردیں اور اپنے دہلی کے دوستوں ارشد مختار اور جمیل الدین عالی وغیرہ سے کلام منگوایا۔ مگر ملازمت کی یہ گاڑی پندرہ دن بھی نہ چلی۔ ہُوا یوں کہ ایک مشاعرہ خواجہ صابر کے مکان پر قرار پایا۔ خواجہ صاحب نے بعض ذاتی وجوہ کی بنا پر اس کی پذیرائی کی اور مجھ سے کہا کہ ان کی نظم "تمثیل"

میں شائع ہوگی۔ میں نے نظم دیکھی تو نہایت گھٹیا اور ناموزوں۔
میں نے اپنے خیال کا اظہار خواجہ صاحب سے کیا تو وہ قدرے
برہم ہوئے اور کہنے لگے اسے ٹھیک کرکے شائع کیجیے ——
میں نے کہا میں ایسا گھٹیا کلام شائع نہیں کروں گا۔ میں رسالے
کا ایڈیٹر ہوں —— وہ گرج کر بولے، میں رسالے کا
مالک ہوں۔ میں نے کہا تو یہ رکھا آپ کا رسالہ اور میں بغیر اپنا
حساب چکائے اُن کے دفتر کے زینے سے اُتر کر پھر سڑک پر
آگیا۔ "تمثیل" کا عید نمبر شائع ہوا جس کا آدھا حصہ میرا ایڈٹ
کیا ہوا تھا اور باقی آدھا رطب و یابس سے بھرا ہوا تھا۔

(۳)

محمد علی روڈ پر مسلم لیگ (بمبئی) کا دفتر تھا۔ وہاں الیکشن
کی تیاریاں شروع ہوئیں تو عارضی طور پر کلرکوں کی ضرورت
پڑی۔ میں نے اس موقعے کو غنیمت سمجھا اور ووٹروں کی لسٹ
تیار کرنے اور ناموں کی چیکنگ وغیرہ کے کام پر ملازم ہو
گیا۔ کچھ دن تو ٹھیک ٹھاک کام کرتے گزرے۔ پھر مسلم لیگ
کے سیکریٹری شیخ صاحب سے جھڑپ ہوگئی۔ ہوا یہ کہ جس ہال
میں ہم بہت سے کلرک تقریباً ایک درجن میزوں پر کام کر رہے
تھے وہاں فوری طور پر مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کی میٹنگ ہونا
طے ہوئی اور شیخ صاحب نے نہایت واہیات اور تضحیک آمیز
لہجے میں ہم لوگوں سے کہا ——
"اٹھاؤ، اٹھاؤ اپنے یہ کاغذ —— جلدی —— یہاں
میٹنگ ہوگی۔" مجھ سے ان کا یہ تحکّم برداشت نہ ہوا۔ میں نے کہا
یہ بھی مسلم لیگ ہی کا کام ہے اور اس طرح ایک دم کاغذ نہیں

سمیٹے جا سکتے، اور آپ ذرا طریقے سے بولیے —— وہ اور
بھپرے —— میں بھی بپھرا (میں تو ایسے موقعوں کی تاک
میں رہتا تھا) بہر طور صدر مسلم لیگ جیند بیگ صاحب نے بیچ
میں بول کر معاملہ رفع دفع کرایا —— مرنجاں مرنج اور
شریف النفس آدمی تھے۔
میں نے کاغذات دفتر کے حوالے کیے اور زینے سے
اُتر کر پھر سڑک پر آگیا۔ اب یہ یاد نہیں بعد میں حقِ محنت
وصول کیا یا نہیں —— شاید نہیں۔

O

میں نے نفسِ مطلب بیان کیا تو سرٹیفکیٹ دینے پر
آمادگی ظاہر کی مگر کچھ دیر بعد کہنے لگے کہ تم ہمارے ہی
دفتر میں نوکری کرلو۔ میں نے کہا کیا نوکری؟ بولے یہ میں
نے یوپی مسلم ایسوسی ایشن بمبئی میں مقیم یوپی والوں کی
فلاح و بہبود کے لیے بنائی ہے تم تو جوان ہو اور اس
انجمن کو چلا سکتے ہو۔ میں تمھیں اس کے آفس سیکریٹری کا
عہدہ دے سکتا ہوں۔ یہیں دفتر ہوگا اور تنخواہ سو روپے
ماہوار۔ سو روپے اور خدمتِ خلق کا کام —— آفس
سیکریٹری —— میں فوراً راضی ہوگیا اور بجائے کیرکٹر
سرٹیفکیٹ کے طاہر صاحب سے پروانۂ ملازمت لے کر لوٹا
تو بھائی جان بہت خوش ہوئے ۔۔۔۔۔

طاہر خاں صاحب کے ایک دُور کے رشتے دار مصاحب
تھے لیاقت علی خاں۔ وہ یوپی مسلم ایسوسی ایشن کے معاملات
میں بھی ٹانگ اڑایا کرتے تھے۔ بد زبان آدمی تھے۔ ایک دن

میرے کمرے میں آئے اور تحکمانہ انداز میں پوچھنے لگے تم کیا کر رہے ہو۔ میں اتفاق سے اس وقت ایک نظم لکھ رہا تھا۔ میں نے کہا کچھ بھی کر رہا ہوں ——— کہنے لگے تم یہاں کام نہیں شاعری کرتے ہو۔ مجھے اس زمانے میں ایسے لب و لہجے کی برداشت نہیں تھی۔ میں نے کڑک کر کہا آپ میرے کمرے میں آنے والے ہوتے کون ہیں؟ نکل جائیے یہاں سے۔ اور جو شکایت کرنا ہو طاہر صاحب سے کیجیے۔ وہ بھنبھناتے ہوئے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد مجھے طاہر صاحب نے بلایا۔ میں نے ان سے کہا میرا ابھی حساب کر دیجیے اور سنبھالیے اپنا رجسٹر۔ انھوں نے میرا حساب صاف کیا اور میں زینے سے اتر کر پھر سڑک پر آ گیا۔

اسے کہتے ہیں ع   خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر!

○

سوچا تو میں نے یہ تھا کہ میں اس مضمون میں رفعت سروش صاحب کی شاعری کو بھی موضوع بحث بناؤں گا لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ ڈاکٹر رضیہ حامد مدیر "فکر و آگہی" کی طرف سے جلد از جلد مضمون بھیجنے کے لیے تقاضے پر تقاضا ہو رہا ہے۔ ابھی تو دراصل ان کی نثر نگاری کے متعلق بہت کچھ کہنا ہے اور میری مصروفیات کا یہ عالم ہے کہ بات ختم کرنے پر مجبور ہوں۔ اب اگر ساتھ ہی ان کی شاعری کا ذکر بھی شروع کرتا ہوں تو نہ جانے کتنے دن اور صرف ہو جائیں ——— اور اگر ماہنامہ "   " کے رفعت سروش نمبر کی اشاعت تک یہ مضمون نامکمل صورت میں میرے ہی پاس رہے تو یہ کوئی عمدہ بات نہیں ہوگی۔

——— ۱۶ر دسمبر ۱۹۸۰ء

جمنا داس اختر

(پنجاب کا ایک محترم اُردو صحافی)

مجھے اس وقت ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا ہے کہ جمنا داس اختر سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی اور کہاں۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں جب میں نے تحریک رفاقت کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر روزنامہ "جے ہند" (لاہور) کے دفتر میں ملازمت کی درخواست دی تو جمنا داس اختر "جے ہند" کے چیف ایڈیٹر مقرر ہو چکے تھے۔ "جے ہند" ایک نیا اخبار تھا جو مہاشے کرشن مالک اور ایڈیٹر روزنامہ "پرتاپ" لاہور کے فرزند شری ویریندر نے جاری کیا تھا۔ اُس وقت سبھاش چندر بوس کا دیا ہوا نعرہ "جے ہند" ہندوستان کے طول و عرض میں بڑی حد تک "نمستے" یا "آداب عرض" کی جگہ پر استعمال ہونا شروع ہو گیا تھا اور سبھاش

چندر بوس سے مخالفت (یا عناد) کے باوجود پنڈت جواہر لعل نہرو اس نعرے کو زندگی بھر استعمال کرتے رہے۔

''جے ہند'' میں ملازمت کے لیے ویریندر جی نے میری درخواست منظور کر لی اور اندازہ بلکہ یقین تھا کہ اُنھوں نے میری درخواست منظور کرنے سے قبل جمنا داس اختر سے ضرور مشورہ کیا ہوگا۔ کیونکہ چیف ایڈیٹر سے مشورہ کیے بغیر کسی اخبار کے کسی مالک کا کسی کو اخبار میں ملازمت دینا ایک ناممکن اَمر تھا اور ایک ناممکن امر ہے۔

میں اس سے قبل روزنامہ ''ٹریبیون'' لاہور میں تیس روپے ماہانہ پر ایک Stringer کے طور پر کام کر چکا تھا۔ وہاں سے ترقی پر روزنامہ ''ملاپ'' لاہور کے اسٹاف میں شامل ہوگیا۔ جہاں میری تنخواہ چالیس روپے ماہانہ تھی۔ اِس کے بعد میں تحریکِ رفاقت میں سوا دو سو روپے ماہانہ پاتا تھا' جب اختر صاحب کی بدولت مُجھے روزنامہ ''جے ہند'' میں دو سو پچاس روپے کی ملازمت مل گئی۔

''جے ہند'' میں آنے سے قبل ''ملاپ'' میں میرا کام انگریزی مضامین اور خبروں کا اُردو میں ترجمہ کرنا تھا۔ اِس سے قبل ''ٹریبیون'' میں میرا کام نامہ نگار یعنی Correspondent کا کام تھا۔ لیکن ایک نچلے درجے کے Correspondent کا۔ اِکا دُکا اہم واقعات کو چھوڑ کر یہ کام کم درجے کی خبریں فراہم کرنا اور اُنھیں اخبار کی ضرورت کے مطابق مرتب کر کے نیوز ایڈیٹر کے حوالے کرنا تھا۔ ان میں سے بعض خبریں چھپ جاتی تھیں اور بعض نہیں چھپتی تھیں۔

''جے ہند'' میں جمنا داس اختر نے دو کام میرے ذمے لگائے۔ ایک تو ہر روز اخبار کے لئے حالاتِ حاضرہ کے تعلق سے اَشعار کہنا اور دُوسرا عمائدِ شہر سے' جن میں پنجاب کے سیاسی لیڈر بھی شامل تھے اور حکومتِ پنجاب کے وزراء اور بڑے بڑے افسر بھی' انٹرویو لینا۔ اس طرح کا ایک انٹرویو جو میں نے شیخ سر عبدالقادر مرحوم سے کیا تھا میری کتاب

''آنکھیں ترستیاں ہیں'' میں بھی شامل ہے۔

اخبار کا اڈیٹوریل ویریندر جی خود لکھا کرتے تھے لیکن ایک بار جب وہ لاہور سے باہر جانے لگے تو مُجھ سے اُنھوں نے امتحان کے طور پر ایک اڈیٹوریل لکھوایا اور اسے پڑھ کے میری تعریف کرتے ہوئے کہا کہ

''میری غیر حاضری میں اڈیٹوریل اختر صاحب ہی لکھا کریں گے لیکن اگر کبھی کبھار آپ بھی لکھ دیا کریں گے تو اختر صاحب کا کام قدرے ہلکا ہو جائے گا، کیونکہ اُن پر سارے اخبار کا بوجھ پہلے ہی زیادہ ہے۔''

اختر صاحب نے ویریندر جی کے اس فیصلے کو پسند کیا۔ حالانکہ اُس زمانے میں اُردو اخبارات کے چیف ایڈیٹر کسی سب ایڈیٹر کو یہ موقع نہیں دیتے تھے کہ وہ کسی اہم کام کو ہاتھ لگائے۔ یہ بات کہنا تو میں بھول ہی گیا کہ مُجھے ''جے ہند'' میں ملازمت اخبار کے شروع ہونے سے تو کوئی ہفتہ دَس دن پہلے مل گئی تھی جبکہ اختر صاحب کو چیف ایڈیٹر شپ بہت پہلے مل چکی تھی۔ ویریندر جی اور اختر صاحب کے باہمی مشورے سے یہ طے پایا کہ ''جے ہند'' کا پہلا شمارہ ایک خاص نمبر کی صُورت میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ ایک بہت بڑے جلسے میں یہ خاص نمبر منظرِ عام پر آیا۔ اختر صاحب کو صحافیانہ کمال کے ساتھ ہی ساتھ قدرت کی طرف سے ادبی ذوق بھی ملا ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے مُجھ سے کہا کہ اس موقع پر محروم صاحب کو خط لکھ کر ایک نظم اگر منگوائی جائے تو اس جلسے کے وقار میں اضافہ ہوگا۔ چنانچہ میں نے والد صاحب کی خدمت میں خط لکھا اور کچھ یاد آتا ہے کہ شاید تار بھی دیا اور اُن کی طرف سے ایک نظم موصول ہوئی جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے

پیدا اُفقِ ہند سے ہیں صبح کے آثار
آنکھوں سے ہے پوشیدہ غلامی کی شبِ تار

میں نے یہ نظم اُس جلسے میں پڑھ کر سنائی۔

اس طرح کوئی ایک ڈیڑھ سال میں اختر صاحب کے ایک اسسٹنٹ کے طور پر "جے ہند" میں کام کرتا رہا اور اس ایک ڈیڑھ سال کی مدّت میں اُردو صحافت کے اُونچ نیچ سے اختر صاحب نے مجھے پوری طرح آشنا کر دیا۔

وقت گزرتا گیا۔ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ اس سے دو تین ماہ قبل تک لاہور کے مستقبل کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں اُڑتی رہیں۔ یہ بھی سننے میں آتا تھا کہ لاہور ہندوستان میں شامل ہوگا۔ جسے سُن کر ہندو خوش اور مسلمان افسردہ ہو جاتے تھے اور کبھی یہ خبر کسی اخبار میں چھپ جاتی تھی کہ لاہور پاکستان میں شامل ہوگا تو اس سے مسلمان خوش اور ہندو افسردہ خاطر ہو جاتے تھے۔ بعض اخبارات میں یہ بھی چھپا کہ دریائے راوی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان حدِ فاصل بنے گا۔ اور ہندو اِس بات سے بھی خوش تھے کہ ہندوستان ہی میں رہے گا لیکن اِس کا فیصلہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی ہو گیا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد لاہور اور امرتسر کے درمیانی بلکہ زیادہ واضح لفظوں میں اٹاری اور واہگہ کے درمیان ظہور پذیر ہوگی۔

ابھی پاکستان بننے میں کچھ مدّت باقی تھی کہ لاہور کے اِرد گرد فسادات شروع ہو گئے۔ اختر صاحب نے مُجھ سے کہا کہ صحیح خبریں اخبارات میں نہیں چھپ رہی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ تم اور میں لاہور سے باہر نکل کے صورتِ حال کا جائزہ لیں اور صحیح خبریں "جے ہند" کو بھیجیں۔ میں نے اُن کی رائے کے ساتھ اتفاق کیا۔ چنانچہ ہم جان ہتھیلی پر رکھ کے لاہور سے نکلے اور مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے شاید گجرات یا لالہ موسیٰ تک جا پہنچے۔ لیکن حالات اِتنے خطرناک تھے کہ دو تین دن میں ہم اپنی جان بچا کر واپس آ گئے۔

پاکستان بنتے ہی لاہور میں بلکہ سارے مُلک میں ہندوؤں کے اخبارات کے دفتر بند ہو گئے۔ اور اخبارات کے مالکوں نے اور ملازموں نے بے سروسامانی کے عالم میں

ہندوستان کے مختلف شہروں کا رُخ کیا۔ ہمیں اس افراتفری کے عالم میں ایک دُوسرے کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا گویا

نسب نامہء دولتِ کیقباد
ورق پر ورق ہر سوئے بُرد باد!

میں لاہور پہنچ کر پہلے تو اُمرتسر پہنچا وہاں بجلی پہلوان نے مُجھے اپنے گھر میں پناہ دی۔ وہاں چند روز ٹھہر کے میں نے دہلی کا رُخ کیا۔ اور کچھ مدّت کے بعد دہلی چھوڑ کر میں پھر لاہور واپس پہنچ گیا۔ چونکہ لاہور کو واپسی اور وہاں سے پھر دہلی کو روانگی کی کہانی میں اپنی سوانح حیات میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں اور زیرِ تحریر مضمون سے اس کا کوئی تعلق بھی نہیں اِس لئے اس بات کو میں یہیں چھوڑتا ہوں اور اتنا ہی بتانا مناسب سمجھتا ہوں کہ دہلی پہنچ کے مُجھے پھر "ملاپ" ہی کے دفتر میں ملازمت ملی اور جمنا داس اختر روزنامہ "تیج" کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ کچھ مدّت تک تو "ملاپ" کا دفتر ہی میرا دن رات کا ٹھکانا بنا رہا۔ لیکن دو تین ماہ بعد جب میرے والدین اپنی دونوں ننھی پوتیوں یعنی میری بچّیوں کو ساتھ لے کر دہلی پہنچے تو اُن کے قیام کا اِنتظام ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ اور ایسا مسئلہ جس کا اُسی روز حل ہونا ضروری تھا جس روز وہ دہلی پہنچے تھے۔ سوال یہ تھا کہ اگر یہ مسئلہ آج ہی حل نہیں ہوتا تو رات کہاں بسر ہوگی۔ اختر صاحب کو یہ بات معلوم ہوئی تو اُنھوں نے دوڑ دھوپ کر کے قرول باغ میں ان کے قیام کا انتظام کر دیا اور ایک بڑی مشکل سے ہم لوگوں کو نجات دِلا دی۔

یہی نہیں بلکہ اُنھوں نے روزنامہ "تیج" (دہلی) کے مالک لالہ دیش بندھو گپتا سے بات کر کے میرے والدِ محترم کو "تیج" ویکلی کا ایڈیٹر بھی مقرر کرا دیا۔ "تیج" ویکلی کوئی چھوٹا موٹا ہفتہ وار اخبار نہیں تھا۔ اُس میں اِبتدا ہی سے جوش ملیح آبادی، یاس یگانہ، تلوک چند محروم، سیماب اکبر آبادی، بیخود دہلوی، جوش ملسیانی، فراق گورکھپوری اور

حفیظ جالندھری کا کلام اور علامہ برج موہن کیفی کے مقالات چھپنے شروع ہو گئے تھے۔ شوکت تھانوی کی مزاح نگاری نے اس ہفتہ وار کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

اختر صاحب اُس وقت خود بھی قرول باغ میں مقیم تھے اور ہم لوگ بھی۔ لیکن ہم دونوں کے مکان چونکہ ''تیج'' اور ''تیج و یکلی'' کے دفاتر سے دُور تھے اور آنے جانے کی کوئی سبیل نہیں تھی اس لئے دفاتر سے قریب مکانوں کی تلاش جاری تھی۔ آخر اختر صاحب کے کہنے پر لالہ دیش بندھو گپتا نے موری گیٹ میں واقع ایک بڑی عمارت میں اختر صاحب اور ہم لوگوں کے لئے دو مکانوں کا انتظام کر دیا۔ اب میرا یہ کہنا ایک طرح سے بیہودگی ہوگی کہ وہ مکان بہت چھوٹے تھے اور ہمارا اُن مکانوں میں گزارا بہت مشکل سے ہوتا تھا کیونکہ اُس زمانے میں سر چھپانے کے لئے جگہ کا مل جانا ہی ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا اور یہ نعمتِ غیر مترقبہ ہمیں جمنا داس اختر کی بدولت حاصل ہو گئی تھی۔

جمنا داس اختر نے ــــــ اُسی زمانے میں ''تیج'' کی ادارت کے ساتھ ہی ساتھ سماجی کاموں میں حصّہ لینا بھی شروع کر دیا۔ اور خصوصاً مغویہ عورتوں اور لڑکیوں کو جنھیں ملک کے مختلف حصوں سے اغوا کر کے غنڈے دہلی کی جی بی روڈ کے بالا خانوں میں پیسہ کمانے کے لیے بٹھا دیا کرتے تھے وہاں سے نکلوا کر ناری نکیتوں اور دُوسری محفوظ جگہوں پر پہنچانے کا انتظام کیا۔ اس ضمن میں اختر صاحب نے جہاں فیلڈ ورک کیا وہاں اُنھوں نے ملک کے اس اخلاقی انحطاط پر کتابیں بھی لکھیں۔

اختر صاحب اس وقت بھی ایک سرگرم صحافی ہیں۔ روزنامہ ''سویرا'' دہلی کے چیف ایڈیٹر ہیں اور دہلی سے باہر کے متعدد انگریزی اور اُردو اخبارات کے نمایندۂ خصوصی کے طور پر بھی کام کر رہے ہیں۔ میں ایک مدّت تک ہفتہ وار ''اخبارِ جہاں'' (کراچی) میں اُن کی طویل رپورتیں پڑھتا رہا ہوں۔

میرے لیے یہ اطلاع انتہائی مسرّت کا باعث ہے کہ مکتبہ ٔ جامعہ لمیٹڈ کے

جنرل منیجر شاہد علی خاں ماہنامہ ''کتاب نما'' کا ''جمنا داس اختر نمبر'' شائع کر رہے ہیں۔ اختر صاحب ہر اعتبار سے اِس اعزاز کے مستحق ہیں۔ اس موقعے پر میں جمنا داس اختر اور مکتبہ ٔ جامعہ لمیٹڈ کو دِلی مبارک باد دیتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ خلاقِ ہر دو جہاں اختر صاحب کو طویل عمر اور صحت سے نوازے تاکہ وہ تادیر اسی طرح زبان و ادب، سماج اور صحافت اور ملک و قوم کی خدمت کرتے رہیں۔

ایں دُعا از من و از جُملہ جہاں آمین باد!

ہمارے کنور صاحب

آج ۷۵ء ہے اور یہ ۴۳ء کی بات ہے۔ بتیس سال پہلے کی۔ لائل پور میں ایک مشاعرہ تھا۔ آل انڈیا مشاعرہ جس کے مہتمم تھے لائل پور کاٹن مِلز کے مالک سر شنکر لال شنکر اور مُرلی دھر شاد۔ یہ وہی مشاعرہ تھا جو بعد میں اِنڈو پاک مشاعرہ دہلی اور اِنڈو پاک مشاعرہ لائل پور کی صُورت میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مدّتوں تک ایک جذبۂ خیر سگالی کے طور پر کام کرتا رہا۔

جب میں اِس مشاعرے میں شرکت کے لیے لاہور سے لائل پور پہنچا تو اکثر شعراء جن میں علامہ کیفی، زار دہلوی، بیخود دہلوی، نوح ناروی، جوش ملسیانی، احسان دانش، ماہر القادری، نخشب جارچوی، شکیل بدایونی، عرش ملسیانی اور صابر دہلوی کے نام قابلِ ذکر ہیں، وہاں پہلے ہی سے موجود تھے۔ ابھی مجھے اپنے خیمے[1] میں فروکش ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ باہر سے احسان

[1] شنکر لال شنکر اور مُرلی دھر پرشاد شعراء کے قیام و طعام کے انتظام میں بذاتِ خود دلچسپی لیتے تھے اور ہم لوگوں کے قیام کا انتظام بہت عمدہ ہوتا تھا۔ وسیع و عریض قطعہ زمین پر پھیلی ہوئی مِل کے احاطے میں ہم لوگوں کے لئے خیمے نصب کروائے جاتے تھے۔ یہ خیمے کمروں سے کہیں زیادہ آرام دہ اور خوبصورت ہوتے تھے۔ فرش پر قالین، دروازوں پر پردے، ملحقہ غسل خانے غرض ہر طرح کا آرام میسر ہوتا تھا۔ اور سارے حسنِ انتظام میں پی۔ بی۔ ساحنی کی جو آج دہلی کے شنکر شاد انڈو پاک مشاعرے کے مہتمم ہیں خوش سلیقگی جھلکتی تھی۔

دانش کی آواز سُنائی دی۔ وہ جگن جگن کہہ کے مُجھے پکار رہے تھے۔ میں باہر نکلا تو بولے چلو تمہیں خواجہ محمد شفیع سے مِلوائیں۔ میرے لیے یہ نام نیا تھا۔ بعد میں تو خواجہ محمد شفیع میرے دِلی دوست بن گئے لیکن اُس وقت تک میں نہ اس نام سے آشنا تھا نہ اِس نام کے کمالات سے۔

ہم دونوں خواجہ محمد شفیع کے خیمے میں گئے۔ وہاں دہلی سے آئے ہوئے شعراء کا ہجوم تھا۔ پلنگ پر، کرسیوں پر، فرش پر شاعروں کا جمگھٹا تھا۔ ہم دونوں بھی بقولِ احسان دانش اس ہجوم میں ''گھسڑ مُسڑ'' ہوگئے۔ علیک سلیک کے بعد احسان دانش نے خواجہ شفیع سے پہلا سوال جو کیا وہ یہ تھا کہ کیا کنور صاحب ابھی تک نہیں آئے؟ میرے لیے یہ نام بھی نیا تھا لیکن مُجھے دیکھ کے بے حد حیرت ہوئی کہ تمام شعراء نے بیک وقت جواب دیا، وہ آ رہے تھے لیکن عین وقت پر کوئی سرکاری کام ایسا آپڑا کہ اُنھیں یہ سفر ملتوی کرنا پڑا۔ حیرت اِس بات سے ہوئی کہ جس نام سے میں قطعاً آشنا نہیں اُس سے تمام شعراء کو اِس قدر دلچسپی ہے کہ سب اُس کے پروگرام سے واقف ہیں اور اُس کے لائل پور میں نہ پہنچنے پر اظہارِ تاسف کر رہے ہیں۔ مُجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے پوچھا ''احسان بھائی! یہ کنور صاحب کون ہیں؟'' اس کا جواب پھر تمام شعراء نے بہ یک وقت دیا ''تم کنور صاحب کو نہیں جانتے......؟ بھئی کنور مہندر سنگھ بیدی۔'' نخشب نے کہا ''کیا تم ابھی تک کنور صاحب سے نہیں ملے؟ شکیل بدایونی بولے ''تم نے اُن کا کلام ریڈیو پر بھی نہیں سُنا۔'' عرش نے کہا ''آج وہ آجاتے تو تم اُن سے مِل کے بھی خوش ہوتے اور اُن کا کلام سُن کے بھی۔'' اب احسان نے میری وکالت کی اور بولے کہ جگن کی ابھی مشاعروں میں شرکت کی ابتداء ہے۔ اس نے آپ میں سے بھی اکثر کو ابھی پہلی بار دیکھا ہے۔ اس پر خواجہ شفیع کے مُنہ سے نکلا ع۔ 'رفتہ رفتہ عشق در کار آورد بیگانہ را' اِس ایک مصرعے ہی سے میں خواجہ شفیع کی مزاجی اور مزاجی کیفیت سے آشنا ہوگیا اور سمجھ گیا کہ یہ ہماری کلاسیکی برادری کا فرد ہے۔

یہ کنور مہندر سنگھ بیدی سے میرا پہلا تعارف تھا —— غائبانہ تعارف، لیکن اِس تعارف

نے میرے دِل میں کنور صاحب سے مُلاقات کا اشتیاق پیدا کر دیا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ چار برس بعد مُلک تقسیم ہو گیا اور ہم لوگ بے گھر اور بے خانماں ہو کر دہلی آ پہنچے۔ پہلے میرے عزیز دوست جمنا داس اختر کی عنایت سے اور پھر روزانہ ''تیج'' کے مالک لالہ دیش بندھو گپتا کے کرم سے سر چھپانے کو جگہ مِل گئی۔ ہمیں اس طرح خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتے چند ہی روز ہوئے ہوں گے کہ ایک دِن بسمل شاہجہان پوری نام کے ایک شاعر ایک دعوت نامہ لیے ہوئے ہمارے گھر پر آئے۔ یہ دعوت نامہ کنور مہندر سنگھ بیدی کی طرف سے تھا اور والدِ محترم کے اور میرے نام تھا۔ دو تین روز بعد دہلی میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا اور کنور صاحب نے ہمیں اس میں شرکت کی دعوت دی تھی۔

میری دیرینہ آرزو بر آئی تھی۔ چار برس پہلے جس شاعر کا نام بڑے ذوق وشوق سے سُنا تھا اب اُس سے مُلاقات ہو رہی تھی۔ میں سراپا اشتیاق بن کے مشاعرے میں پہنچا۔ کنور صاحب وہاں پہلے ہی سے موجود تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ والدِ محترم کے ساتھ مُلاقات میں اُنھوں نے خاص جذبۂ احترام کا اظہار کیا۔ مُجھ سے پہلی ہی مُلاقات میں بڑی بے تکلفی سے بات کی۔ بولے۔ تمہارے کلام اور شعر خوانی دونوں کی میں نے بہت تعریف سُنی ہے۔ آج جی بھر کے تمہیں سُنیں گے۔ مُجھے اُن کی یہ بے تکلفی کی ادا بہت بھلی لگی۔

مشاعرہ شروع ہوا۔ کنور صاحب ایک مخصوص انداز سے شعراء کا تعارف کرا رہے تھے جس میں ادبیات کے ساتھ ساتھ مزاح کی چاشنی بھی موجود تھی۔ بسمل شاہجہان پوری اپنی لمبی چوڑی داڑھی سمیت جب مائکروفون پر آئے تو کنور صاحب نے اُن کے تعارف میں جوش صاحب کی یہ رُباعی پڑھی ـــــ

ع - یہ شیخ تو مصروفِ عبادت ہوں گے

اس پر مشاعرہ ایک قہقہ زار بن گیا۔

میرے تعارف میں اُنھوں نے وہی بات کہی جو تھوڑی دیر قبل کہہ چکے تھے یعنی یہ کہ میں

نے اُنھیں آج تک نہیں سُنا لیکن ان کے کلام اور پڑھنے کی تعریف سُنی ہے۔ اب سامعین ان دونوں باتوں کے بارے میں خود اپنی رائے قائم کریں گے۔ میں اُس وقت نیا نیا لاہور سے آیا تھا۔ اپنا گھر اور اپنا شہر چھوڑنے کے بعد ابھی تک ایک ہی نظم کہی تھی ـــــ

''نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گذری''

بھی اُس وقت سُنائی۔ چند متفرق اشعار بھی۔ داد بہت ملی لیکن اب کہہ نہیں سکتا کہ سامعین نے میرے کلام اور میری شعر خوانی کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہو گی۔

والدِ محترم کا تعارف کنور صاحب نے بڑی محبت اور بڑے احترام سے کرایا۔ یہ بھی کہا کہ آپ ایک شرنارتھی یا مہاجر بن کے دہلی میں آئے ہیں۔ اب ہم دہلی والوں کا فرض ہے کہ اُن کے آرام و آسائش کا خیال رکھیں اور اُنھیں کوئی تکلیف نہ ہونے دیں۔ واضح رہے کہ کنور صاحب اُس وقت خود دہلی میں ایک مہاجر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگرچہ وہ ایک مدّت سے دہلی ہی میں سٹی مجسٹریٹ تھے لیکن اُن کی لاکھوں یا کروڑوں کی جائداد اور گھر بار منٹگمری میں تھا جو ان کی عدم موجودگی ہی میں لُٹ لٹا گیا اور اس طرح سے کہ

ع - 'ورق بر ورق ہر سوئے بُرد باد'

لیکن اس کے باوجود اِنتہائی صبر و تحمل اور بُردباری کے ساتھ اُن تمام نقصانات کو فراموش کیے ہوئے اپنے آپ کو دہلی والا کہہ رہے تھے اور دہلی کے اہلِ قلم اور سخن شناسوں کو اس امر کی تلقین کر رہے تھے کہ مرحوم صاحب کو غریب الوطنی کا احساس نہ ہونے پائے۔ میں کنور مہندر سنگھ بیدی کے ساتھ اپنی اُس پہلی مُلاقات سے بے حد متاثر ہوا۔

والد نے اِس مشاعرے میں اپنی نظم ''پاکستان کو الوداع'' پڑھی اور اہلِ دل آج بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس نظم نے سامعین پر کیا اثر کیا ہو گا۔

(۲)

اسی مشاعرے میں مَیں نے پہلی بار کنور صاحب کا کلام سُنا اور پہلی بار مُجھے معلوم ہوا

که ان کا تخلص سحر ہے۔ کنور صاحب کو اس مشاعرے میں بے اندازہ داد ملی۔ مجھے اُس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی اور داد کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اِس کا ثبوت بعد کے اُن تمام مشاعروں میں ملا جن میں مجھے کنور صاحب کو سُننے کا اتفاق ہوا اور اُن مشاعروں کی تعداد خُدا جانے کہاں تک پہنچتی ہے۔ آپ نے اِس مشاعرے میں غزلیں بھی سُنائیں، قطعے بھی اور رُباعیات بھی۔ آپ کی غزلیں کلاسیکی انداز لیے ہوئے تھیں۔ رعایتِ لفظی و معنوی کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ مضمون آفرینی بھی تھی۔ معاملہ بندی بھی ——— گویا وہ تمام خاصیتیں موجود تھیں جو ''شعرالعجم'' میں علامہ شبلی نعمانی نے غزل کے لیے ضروری قرار دی ہیں۔ میں اُس زمانے میں ترقی پسندی سے نیا نیا متاثر ہو رہا تھا اور اپنی شاعری میں اُن شعری قواعد و ضوابط کی پابندی بھی کر رہا تھا جو قدماء نے شعر کے لیے ضروری قرار دیئے ہیں اور اُن سے انحراف کی طرف بھی مائل تھا۔ گویا میں ایک طرح سے تخلیقِ شعر کے معاملے میں دوراہے پر تھا۔ کنور صاحب کے کلام میں مجھے زبان و بیان کا پورا احترام نظر آیا اور میں نے دیکھا کہ زبان و بیان کا احترام شعر میں کِس طرح سے ایک حُسن پیدا کر دیتا ہے۔

اس مشاعرے کو آج چوتھائی صدی سے زیادہ مدّت ہونے کو آئی ہے اور مجھے اتنا کہاں یاد کہ کِس شاعر نے اُس وقت کیا کلام پڑھا تھا لیکن ایک شعر جو سحر صاحب نے اُس وقت پڑھا مجھے آج بھی یاد ہے اور صرف یاد ہی نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے haunt بھی کر رہا ہے اور وہ شعر یہ ہے۔

اک اور عمر دے کہ تجھے یاد کر سکیں
یہ زندگی تو نذرِ خرابات ہو گئی

اس مشاعرے میں جوش ملیح آبادی بھی شریک تھے، بسمل سعیدی بھی، عرش ملسیانی بھی، ساحر ہوشیارپوری بھی اور وہ شعراء بھی جو ایک ایک کر کے ہم سے بچھڑتے چلے گئے مثلاً علامہ

کیفی دہلوی، ہری چند اختر، روش صدیقی، روشن دہلوی، طالب دہلوی، مخمور دہلوی، غلام احمد فرقت اور شمیم کرہانی۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

(۳)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان کی صحیح پرکھ اُس وقت ہوتی ہے جب اُس کے امتحان کا وقت آتا ہے۔ ہندو مُسلم اِتحاد یا سیکولرزم اور سوشلزم کے موضوع پر نظمیں کہنا اور مشاعروں میں جا کے یہ نظمیں سُنانا اور بات ہے اور امتحان سامنے ہو تو اِن نظریات پر ثابت قدم رہنا دُوسری بات۔ ہم شعراء کو اکثر اس قسم کے امتحان میں پڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ہم نے یہ امتحان قربانی دینے والے قومی رہنماؤں کے سُپرد کر رکھا ہے خواہ وہ مہاتما گاندھی ہوں یا ابوالکلام آزاد اور خواہ جواہر لال نہرو ہوں یا شیخ محمد عبداللہ۔ ہم نے اپنا کام یہی سمجھ رکھا ہے کہ ہمیں ان موضوعات پر صرف نظمیں ہی کہنا ہیں لیکن مہندر سنگھ بیدی سحر ہم شاعروں کی برادری ہی کے ایک فرد ہیں اور اس امتحان سے دو چار بھی ہوئے ہیں اور اس امتحان میں پڑنے کے بعد اس طرح کامیاب ہوئے ہیں کہ ہندوستان کے تمام شاعر اور ادیب اِس بات پر اِنتہائی فخر کے ساتھ سر اُونچا کر سکتے ہیں کہ ہماری برادری کے ایک فرد نے اپنا وہ فرض انتہائی کامیابی کے ساتھ پورا کیا ہے جسے ''فرضِ انسانیت'' کہا جاتا ہے۔

۴۷-۴۸ء کا زمانہ تھا' ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم کی حدِ فاصل کھنچ چکی تھی اور پاکستان، مشرقی پنجاب اور دہلی میں اِنسان مولی گاجر کی طرح کٹ رہا تھا۔ میں نے یہ نقشہ راولپنڈی سے لے کر دہلی تک اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ سڑکوں پر' پلیٹ فارموں پر' کھیتوں میں' ہر جگہ لاشوں کے اُنبار کے اُنبار دیکھے تھے لیکن مشرقی پنجاب میں ایک ضلع ایسا

بھی تھا —— کانگڑہ، —— جہاں کا ڈپٹی کمشنر، ہمارا یہی محترم شاعر دوست تھا۔ گورونانک دیو کے خاندان کا چشم و چراغ جس نے خدا جانے وہاں کے ہندوؤں اور سِکھوں پر کیا جادو کر دیا تھا کہ بتانے والے بتاتے ہیں سارے ضلع میں کِسی مُسلمان کی نکسیر تک تو نہیں پھوٹی۔

کنور مہندر سنگھ بیدی کا یہی کردار اُس زمانے میں بھی پوری شدّت کے ساتھ نمایاں رہا جب آپ دہلی میں سٹی مجسٹریٹ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آپ کا گھر اور دفتر دونوں ستم رسیدوں اور مظلوموں کی پناہ گاہیں تھیں۔ بالخصوص مُسلمانوں کے دِلوں میں تو آپ نے اِس طرح گھر کر لیا تھا کہ ایک بار جب حکومتِ پنجاب نے ان کو پنجاب واپس بُلانا چاہا تو دہلی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک وفد وزیرِاعظم پنڈت جواہرلال نہرو کے پاس یہ مطالبہ لے کر پہنچا کہ اُنھیں دہلی سے تبدیل نہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ شہر میں بسنے والے ستم رسیدوں کی حفاظت کے لیے ایک ضمانت ہیں خواہ وہ ستم رسیدگان ہندو ہیں، سِکھ ہیں یا مُسلمان۔

میں سمجھتا ہوں جوش ملیح آبادی نے اپنے اس شعر میں کِسی قسم کے مبالغے سے کام نہیں لیا جب اُنھوں نے کہا ؎

اگر نظارۂ خیرِ مجسّم کی تمنّا ہے
مہندر سنگھ بیدی کو تم اے اہلِ نظر دیکھو!

(۴)

مالک رام صاحب' کنور مہندر سنگھ بیدی کے کمالِ فن اور حُسنِ کردار کا ذکر اگر میں تفصیل سے کرتا چلا جاؤں تو یہ مقالہ پھیل کے ایک ضخیم کتاب بن جائے گا اور پھر اُس مہندر سنگھ بیدی نمبر میں نہ سما سکے گا جس کے لیے یہ سطور سپردِ قلم کر رہا ہوں۔ اس لیے سوچتا ہوں کہ ذرا قلم تھام کے چلوں تاکہ ایسا نہ ہو یہ اپنی طوالت ہی کی بنا پر شائع ہونے سے رہ جائے ورنہ جہاں تک اِس محبوب شخصیت کی ذات و صفات کے ذکر کا تعلق ہے:

ع - 'این نہ بحریست کہ پایان و کنارے دارد'

(۵)

تقسیمِ ہند کے فوراً بعد جناب ودیا شنکر آئی.سی.ایس کی کوششوں سے ماہنامہ "آج کل" نے دوبارہ جنم لیا اور اس شان سے کہ اپنے ساتھ "بساطِ عالم" اور "نونہال" کو بھی معرضِ وجود میں لے آیا۔ نہ ہوا اُس وقت فیملی پلاننگ کا زور و شور' ورنہ شنکر صاحب اسی جُرم میں دھر لیے جاتے کہ اُنھوں نے اُردو کے بہ یک وقت ایک نہیں' دو نہیں' تین رسالوں کا وجود ہندوستان پر مسلط کر دیا ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ آج بعض حلقوں میں جس شخص کو اُردو کا یا مسلمانوں کا دُشمن قرار دیا جاتا ہے —— سردار پٹیل اُسی کی سرپرستی میں ودیا شنکر نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔

آج جب اتنی مدّت بعد میں ۴۸ء پر ایک نگاہِ پس انداز ڈالتا ہوں تو ایسا نظر آتا ہے کہ "آج کل" ایک ماہنامہ نہیں تھا بلکہ ایک ادارہ تھا۔ ایک انجمن تھی، ایک تحریک تھی، ایک محفل تھی جو برہم ہوگئی۔ ایک دور تھا جو گذر گیا۔ اِس محفل میں کئی شخصیتیں اپنی اپنی جگہ پر جانِ محفل کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جوش ملیح آبادی جن کی یاد آتی ہے تو آج بھی اقبال کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے ؎

اے کہ نزدیک تراز جانی و پنہاں زنگہ
ہجرِ تو خوشترم آمد ز وصالِ دگراں

ودیا شنکر آئی.سی.ایس کی دِلکش زبان و بیان اور نکتہ آفرینی کی بدولت بات میں بات پیدا ہوتی چلی جاتی تھی۔ شنکر پرشاد آئی.سی.ایس کی گفتگو بہ یک وقت شمیمِ گُل اور نوکِ نشتر کا انداز رکھتی تھی۔ ودیا شنکر اور شنکر پرشاد کے اکثر جُملے آج بھی "باقیات الصالحات" کی زبانوں پر ہیں۔ کبھی کبھی "آج کل" جب میں اور بِسمل سعیدی آپس میں ملتے ہیں تو ان جملوں کو یاد کر کے ایک دُوسرے کو ہنساتے بھی ہیں اور رُلاتے بھی ہیں:

ع - کیا رات تھی کہ ایک کہانی میں کٹ گئی'

فلسفے کے مشہور پروفیسر سری کرشن سکسینہ اس محفل کے ایک اہم رُکن تھے۔ باتیں کرتے تھے تو پھول جھڑتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جوش اور سکسینہ یک جان دو قالب تھے تو غلط نہ ہوگا۔ جوش اُنہیں پیار سے ''سنگ سینہ'' کہتے تھے۔

ایک نکہتِ گُل کا ذکر کیے بغیر یہ داستان ادھوری رہے گی کہ وہ محفل اس کے ساتھ ہی اپنے جوبن پر آتی تھی۔ اب سال ہا سال بعد جب یادِ ماضی کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے میں اپنے ایّامِ جوانی کی راکھ کرید رہا ہوں تو کہیں کہیں دبی چنگاریاں بھی سُلگتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ اور میں سوچتا ہوں کہ کیا وہ دور ہمیشہ کے لیے ماضی کے دُھندلکوں میں گم ہو گیا ہے؟ کیا وہ زمانہ کبھی واپس نہ آئے گا جب غالب کا یہ مصرع ایک بار پھر میرے جذبِ شوق کی ترجمانی کر سکے ——

اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ!

—— اور اُن تمام محبوب چہروں اور محبوب شخصیتوں کے ساتھ ہی ساتھ جو شخصیت شمعِ محفل بھی تھی اور پروانہ محفل بھی وہ مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت تھی۔ آپ اس محفل کو برقرار رکھنے کے لیے وقت، روپیہ اور رسوخ، کسی شے کو استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ مجھے اُس زمانے میں اکثر ڈر رہتا تھا کہ کہیں اِس محفل کو نظر نہ لگ جائے لیکن نظر کا کیا —— سوال —— گردشِ ایّام اپنی جگہ پر ایک اٹل حقیقت ہے۔ اُسی زمانے میں مَیں نے ایک شعر کہا تھا

محفل جمی ہوئی ہے تری راہ میں کہیں
اے گردشِ زمانہ بس اتنا خیال کر

اور حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ سب سے پہلا حادثہ تو یہ ہوا کہ جوش پاکستان چلے گئے۔ گویا اس قصرِ نشاط کے بنیادی پتھروں میں سے ایک پتھر ہل گیا۔ اس کے باوجود یہ محفل دہلی میں کسی نہ کسی انداز سے جمی رہی اور غالباً آج بھی اسی طرح سے شاد و آباد ہے

خُدا جانے یہ دُنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

لیکن میں چونکہ آج اس دہلی سے اور اس انجمن سے دور ہوں اس لیے مجھ پر ایک طرح سے ''من مردم جہاں مرد'' کی سی کیفیت طاری ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس محفل کی کشش نے مجھے کتنی بار سری نگر سے دہلی کھینچا اور ہندوستان کے مختلف حصّوں میں جاتے ہوئے یا واپس آتے ہوئے کتنی ہی بار یہ محفل میرے لیے زنجیر پا بنی —— خدا کرے یہ محفل ہمیشہ شاد و آباد رہے اور اس محفل کو شاد و آباد رکھنے والے جن میں مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے ہمیشہ زندہ و پائندہ رہیں:

ع - ایں دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!

تو میں ۱۹۴۸ء کا ذکر کر رہا تھا ''آج کل'' کا دفتر جوش صاحب کی وجہ سے مرجع خاص و عام تھا۔ سردار جعفری، جب کبھی جیل سے باہر ہوتے تھے، اکثر دہلی کا اور اس کے ساتھ ہی ''آج کل'' کے دفتر کا پھیرا کیا کرتے تھے۔ اُن کے علاوہ جاں نثار اختر، ظ۔ انصاری، معین احسن جذبی، آلِ احمد سرور، فراق گورکھپوری، احتشام حسین، جعفر علی خان اثر، مخمور لکھنوی، سراج لکھنوی، قدیر لکھنوی، ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر اعجاز حسین، مالک رام، رشید احمد صدیقی، اسلم خان، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، یہ سب احباب اگر دہلی آتے تھے تو ''آج کل'' کے دفتر میں آنا ضروری سمجھتے تھے۔ ساحر لدھیانوی ابھی دہلی ہی میں تھے۔ ''شاہراہ'' کی ادارت کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے وامق، سردار، جذبی، ساحر، جاں نثار اختر ''آج کل'' کے دفتر میں جمع تھے۔ مجاز مرحوم بھی موجود تھے، کنور مہندر سنگھ بیدی بھی۔ شعر و شاعری اور خوش گپیوں کا دور چل رہا تھا کہ عرش ملسیانی نے جو ''آج کل'' کو مرتب کرتے تھے یہ تجویز پیش کی کہ آج جو شعراء یہاں جمع ہیں اُن کا ایک گروپ فوٹو لیا جائے جو ''آج کل'' اور ''شاہراہ'' دونوں میں چھپے۔ یوں اس تجویز میں کوئی خرابی نہیں تھی لیکن دراصل یہ دور ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا اور شعراء اور ادیب فکری اعتبار سے دو حصّوں میں منقسم تھے۔ ایک وہ جو ترقی پسند تحریک میں شامل تھے اور دوسرے وہ جو شامل نہیں تھے۔ چونکہ اُردو کے اکثر ادیب اور شاعر مثلاً سردار جعفری، غلام ربانی تاباں، وامق جونپوری، خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے اس لیے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے دلوں میں حکومت اور

اہلِ حکومت کے خلاف ایک جذبہ موجود تھا اور اس جذبے کا اظہار کئی طریقوں سے ہوتا رہتا تھا۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ ترقی پسند رسالوں اور جریدوں میں اُن شاعروں اور ادیبوں کے مضامین نظم و نثر نہیں چھاپے جاتے تھے جو تحریک کے نقطۂ نگاہ سے حکومت کے ساتھ تھے۔ اس زُمرے میں آنند نرائن ملا بھی آتے تھے جو الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج تھے، صدیق حسن آئی سی ایس بھی جو آگرے میں کمشنر تھے، حبیب احمد آئی سی ایس بھی جو غالباً اُتر پردیش میں پبلک سروس کمیشن کے چیر مین تھے، ذُوالنورین بھی جو لکھنؤ میں کین کمشنر تھے، سیّد حامد بھی جو اس زمانے میں میرٹھ کے ڈپٹی کمشنر تھے اور مہندر سنگھ بیدی بھی جو دہلی کے سٹی مجسٹریٹ تھے۔ اُب سوال پیدا یہ ہوتا ہے کہ جوشؔ ملیح آبادی، سکندر علی وجد، دیویندر ستیارتھی، سلام مچھلی شہری اور راقم التحریر کس زمرے میں تھے۔ جوشؔ صاحب کی تو خیر بات ہی اور تھی۔ ''دیوانہ باش تا غمِ تو دیگراں خورند'' کے مصداق اُنھوں نے تو ''معصومیت'' کا ایسا لبادہ اوڑھ رکھا تھا کہ جواہر لال نہرو ہوں یا سردار پٹیل ہوں، ابوالکلام آزاد ہوں یا ڈانگے ہوں سب اُنھیں ''شاعر''[1] ہی سمجھتے تھے —— ویسے انھیں ''شاعرِ انقلاب'' کا لقب غالباً ترقی پسند تحریک ہی نے دیا تھا۔ عرش بے حد محتاط تھے اور ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ظاہری السّلام علیکم سے کبھی آگے نہ بڑھے۔ باقی تین شعراء کے بارے میں صحیح یا غلط خیال یہ تھا کہ FELLOW TRAVELLRS ہیں چنانچہ ہم تینوں کو اگرچہ ترقی پسندوں نے ''اپنا'' کبھی نہ سمجھا لیکن ہمارے ساتھ بیگانوں کا سا سلوک بھی نہ کیا۔[2]

---

[1] محشر والوں نے بھی مجھ کو شاعر کہہ کر چھوڑ دیا میری فردِ عمل کو سمجھے مجموعہ افسانوں کا (حفیظ)

[2] جہاں تک میرا تعلق ہے جب اُس زمانے میں میرا پہلا مجموعۂ کلام ''بیکراں'' شائع ہوا تو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے اس کا بھرپور خیر مقدم کیا۔ فراق گورکھپوری، احتشام حسین، آل احمد سرور (جو اُس زمانے میں ترقی پسند تھے)، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، غلام ربانی تاباں، فیض احمد فیض، قتیل شفائی، اور فارغ بخاری نے خاص طور سے اس مجموعے کی تعریف کی۔ دوسرے مجموعۂ کلام ''ستاروں سے ذروں تک'' کو بھی ترقی پسند حلقوں میں پوری طرح سراہا گیا۔ سردار جعفری نے جنھیں ترقی پسند تحریک کا دستِ شمشیر زن کہا جاتا تھا ''ستاروں سے ذروں تک'' کے بارے میں بہت عمدہ جملے لکھے۔ اُنھی دنوں سردار جعفری نے ایک طویل مقالہ سکندر علی وجد کی شاعری پر لکھا تھا جو ''آج کل'' میں شائع ہوا تھا۔ سلام مچھلی شہری کے کلام کی بھی ترقی پسند حلقوں میں پوری طرح سے پذیرائی ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود ہم تینوں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے سگے بھائی نہیں ٹھہرائے گئے۔

تو عرش صاحب نے جب گروپ فوٹو کی تجویز پیش کی تو یہ تجویز سردار جعفری، وامق اور جذبی کو پسند نہ آئی۔ اُنھیں جوش کی، عرش کی اور میری شرکت پر اعتراض نہ تھا۔ بلونت سنگھ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اُن پر بھی اُنھیں اعتراض نہ تھا بلکہ بلونت سنگھ کو وہ مجھ سے بھی اپنے زیادہ قریب سمجھتے تھے لیکن ایک سٹی مجسٹریٹ کی تصویر میں موجودگی اُنھیں گوارہ نہ تھی۔ اور سٹی مجسٹریٹ بھی ایسا جو خاصی حد تک براہ راست سردار پٹیل کی نگرانی میں کام کر رہا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ سردار پٹیل چونکہ ہوم منسٹر تھے اور شاعروں اور ادیبوں کے خیال میں تمام گرفتاریاں ہوم منسٹری یا ریاستوں کے ہوم ڈیپارٹمنٹوں کے حکم سے ہوتی تھیں۔ اس لیے ترقی پسند تحریک کے تمام حامی سردار پٹیل کو بالخصوص ناپسند کرتے تھے۔ سنجیدہ بات ہو رہی ہو یا ہنسی مذاق کی سردار پٹیل کو ہدفِ ملامت بنانا ترقی پسند ادیبوں کا شیوہ تھا۔[1]

بہرطور جذبی، سردار اور وامق نے اس خیال کا اظہار دبی زبان سے کیا۔ کنور صاحب تک یہ بات نہ پہنچی —— اور اس وقت تک جذبی یا سردار یا ساحرؔ کنور مہندر سنگھ بیدی کے محاسن سے غالباً پوری طرح آشنا بھی نہ تھے —— نتیجتاً سردار تو عین فوٹو کے وقت اِدھر اُدھر ہو گئے۔ معلوم نہیں کہاں چلے گئے۔ جذبی شریک ہوئے لیکن انتہائی کیفیتِ انقباض میں۔ بعد میں اُنھوں نے ساحر کو یہ مشورہ دیا کہ یہ فوٹو ''آج کل'' میں چھپے تو چھپے اسے ''شاہراہ'' میں نہ چھاپنا۔ غالباً ساحر نے ہامی بھی بھر لی لیکن دوسرے دن ایک محفل میں جس میں باہر کے یہ تمام شعراء موجود تھے کنور صاحب کی غیر حاضری میں جب ان کا تذکرہ چھڑا اور جوش ملیح آبادی اور دوسرے احباب نے کنور صاحب کے متعدد کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالی تو شعراء حضرات یہ تمام باتیں سن کے ہکا بکا رہ گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ جو تصویر محض ایک سٹی مجسٹریٹ کی موجودگی کی وجہ سے رَد ہو چکی تھی اور

---

[1] ایک دفعہ کا ذکر ہے ساحر لدھیانوی بمبئی سے دہلی آئے اور چیلمسفورڈ ویزن میں مجھ سے ملنے کے لیے بھی آئے۔ میرے ہی کمرے کی بات ہے۔ وہ بیٹھے تو میں نے چائے منگوائی۔ ساتھ ہی کھانے کے لیے کوئی نمکین چیز بھی آ گئی۔ ساحر نے چائے پیتے ہوئے کہا کہ یہ نمکین تم کھاؤ تم سردار پٹیل کی منسٹری میں کام کرتے ہو اور میں سردار پٹیل کا نمک خوار نہیں بننا چاہتا۔

اس قابل نہ تھی کہ اسے "شاہراہ" میں چھاپا جائے وہ کنور مہندر سنگھ بیدی کی ذات کی بدولت "مردُود" سے "مقبول" ہوگئی اور ساحر نے اسے بڑے اہتمام سے "شاہراہ" میں چھاپا۔

(۶)

اِس وقت میں یہ مقالہ سری نگر سے دُور ایک تنہا اور پُر فضا مقام پر بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں۔ کنور صاحب کا مجموعہ کلام یا کوئی ایسا ماہنامہ میرے سامنے نہیں ہے جس کی مدد سے میں اس مقالے کو اُن کے اشعار سے مزیّن کرسکوں۔ چنانچہ میں دو ایک واقعات کا ذکر کر کے اسے ختم کروں گا۔ لیکن ان واقعات سے پہلے یہ بتا دینا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کو فی البدیہہ شعر کہنے میں جو مہارت حاصل ہے وہ بہت کم شاعروں کو حاصل ہوگی۔ ایک زمانہ تھا کہ بدیہہ گوئی کو فنِ شعر گوئی کا ایک کمال سمجھا جاتا تھا۔ آج اقدار بدل گئی ہیں لیکن اقدار کے بدل جانے سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتیں۔ شعروادب میں گہری نگاہ رکھنے والوں کے نزدیک بدیہہ گوئی آج بھی ایک کمالِ فن کی حیثیت رکھتی ہے۔

مُجھے یاد ہے کہ ایک بار کنور مہندر سنگھ بیدی کے ساتھ اُن کی گاڑی میں جوش ملیح آبادی، بسمل سعیدی، بسمل شاہجہان پوری اور میں انڈیا گیٹ کی سیر کو نکلے۔ گاڑی میں شعروشاعری کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک شاعر مصرع دیتا تھا باقی اس پر گرہیں لگاتے تھے۔ اور یہ صورتِ حال اس شِدّت سے جاری رہی کہ واپسی تک دو تین غزلیں اور کئی قطعات مکمل ہو چکے تھے۔ ان شاملاتی غزلوں اور قطعات میں کنور صاحب کا بھرپور حصّہ تھا۔ مُجھے یاد ہے میں نے ساری رُودادِ سفر کو سمیٹتے ہوئے ایک مقالہ لکھا تھا جس میں ہر مصرعے اور ہر شعر کے ساتھ شاعر کا نام درج کیا تھا۔ یہ مقالہ دہلی کے ایک ہفتہ وار اخبار میں چھپا تھا۔ یہ مخصوص شمارہ بھی ان پانچ ہزار سے زائد کتب اور جرائد میں شامل تھا جو سری نگر آنے سے قبل میں دہلی میں چھوڑ کے آیا تھا۔ دیمک نے ان کتابوں کو صفحۂ ہستی ہی سے نابود کر دیا۔

اَب کہاں کا مقالہ اور کہاں کا شمارہ

ع - دِل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم!

(۷)

چیمسفورڈ کلب میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ہندوستان کے ایک نامور شاعر نے جو شراب کے نشے میں دُھت تھے بوتل کا زیادہ تر حصّہ ختم کرنے کے بعد مائکروفون پر آ کر اناپ شناپ شروع کر دی۔ اِس اناپ شناپ کی تان کنور سنگھ بیدی ہی پر آ کر ٹوٹتی تھی۔ کنور صاحب ہی اس مشاعرے کو کنڈکٹ کر رہے تھے۔ اس نامور شاعر کی "عالمانہ بات چیت" مشاعرے میں موجود ہر شاعر اور ہر سامع کو ناگوار گذر رہی تھی اور یہ بھی بعید نہیں تھا کہ اس شاعر کو مائکروفون سے ہٹا دیا جاتا لیکن کنور صاحب نے اپنی روائتی بُردباری سے کام لیتے ہوئے اُسے اجازت دے دی کہ جو جی میں آئے کہے چلے جاؤ۔ آخر وہ شاعر صاحب جب اپنی تقریر بازی سے خود ہی تھک گئے تو مائک چھوڑ کر ڈائس سے نیچے آ گئے۔
یہ شاعر میرے ہی مہمان تھے۔ صبح کو جب بیدار ہوئے تو اُنھیں رات کی بات یاد آئی۔ مجھ سے پوچھنے لگے "رات کو میں نے کیا کہا تھا؟" میں نے بتایا کلب میں جب یہ واقعہ ہوا میں اُس وقت موجود نہیں تھا۔ ہم چند شعراء اُس وقت پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر سجاد حیدر کے گھر میں تھے۔ وہاں سے مشاعرہ گاہ میں پہنچے تو پتہ چلا کہ قیامت گزر چکی ہے۔

میں نے دیکھا کہ میرے مہمان شاعر بہت عالمِ تاسف میں ہیں اور تاسف اُنھیں اس بات کا نہیں تھا کہ شراب پی کے بھری بزم میں اُنھوں نے ناشائستہ باتیں کی ہیں۔ اُنھیں اندیشہ یہ تھا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی ان سے خفا ہو جائیں گے اور اُنھیں آئندہ مشاعرے میں نہیں بلائیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اس ضمن میں بالکل مشوش نہ ہوں۔ اس واقعے کا چاہے کنور صاحب نے کوئی بھی اثر لیا ہو اس کا یہ نتیجہ کبھی نہیں نکلے گا کہ

آپ سے اس طرح انتقام لینے کی کوشش کریں۔

چنانچہ چند ماہ بعد جب چیمسفورڈ کلب میں ایک اور مشاعرے کی داغ بیل پڑنے لگی تو کنور صاحب نے ساری مینجنگ کمیٹی کی مخالفت کے باوجود سرفہرست اسی شاعر کا نام لکھا اور پورے احترام کے ساتھ اُسے دعوت دی۔

یہ تحمل اور بُردباری کنور مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت اور شاعری دونوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔ ہندوپاک جنگ کے موضوع پر اُن کی نظموں کا مرکزی خیال یہی ہوتا ہے اور اس ضمن میں وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ' کی زندگی کا وہ واقعہ جس میں ایک پہلوان حیدر کرّار سے شکست کھانے کے بعد ان کے روئے مبارک پر تھوکنے کی گستاخی کرتا ہے' اکثر سُناتے ہیں اور فخر سے اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ اس معاملے میں حضرت علیؓ کا تتبع عروجِ آدمیت ہے۔

اس موضوع پر کہی ہوئی ان کی نظموں کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ ان میں کہیں بھی پاکستان یا اہلِ پاکستان کے خلاف غصّے یا نفرت کے جذبے کا شائبہ تک نظر نہیں آتا بلکہ جہاں تک پاکستانی عوام کا تعلق ہے یہ نظمیں خلوص و محبت کے چھلکتے ہوئے پیمانے نظر آتے ہیں۔ ہاں ان نظموں کا خالق اس استبدادی نظامِ حکومت پر ضربِ کاری لگانے سے نہیں چوکتا جس نے دُنیا کے طول و عرض میں جنگ و جدل کو عام کر رکھا ہے۔

میں نے مہندر سنگھ بیدی کی صدارت میں سینکڑوں مشاعرے پڑھے ہوں گے اور سینکڑوں محفلوں میں ان کے ساتھ خوش گپیاں کی ہوں گی۔ ہر مشاعرے اور ہر محفل میں انھیں جانِ مشاعرہ اور جانِ محفل ہی پایا ہے۔ اُردو کے ساتھ ان کی محبت عشق کے درجے تک پہنچی ہوئی ہے۔ اُردو کا مقدمہ وہ آج بھری محفلوں میں جس خلوص اور جوش و خروش کے ساتھ پیش کرتے ہیں اُسی خلوص اور جوش و خروش کے ساتھ اُس وقت بھی پیش کرتے تھے جب وہ سٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کمشنر کے عہدوں پر فائز تھے۔ اعلائے کلمۃ الحق آپ کے

لیے محض ایک اصول ہی نہیں بلکہ وضعِ زندگی اور طرزِ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں نے سحر صاحب کو ہندوستان کے مشاعروں میں بھی دیکھا ہے اور پاکستان کے مشاعروں میں بھی اور دونوں جگہ ان کی مقبولیت پورے عروج پر نظر آئی ہے۔ اس مقبولیت میں شاعری اور شخصیت کے اُن تمام اجزاء کو دخل ہے جو کنور مہندر سنگھ بیدی نام کے انسان کی تشکیل میں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ اور تحلیل ہو چکے ہیں کہ ان تمام کا الگ الگ تجزیہ کرنا دشوار ہی نہیں ناممکن بھی ہے اور اس تجزیے کی کاوش میں ایک ایسی جامع الصفات شخصیت نظر کے سامنے اُبھرتی ہے جو ہندوستان اور پاکستان کے طول و عرض میں ایک منفرد اور محبوب نام سے جانی اور پہچانی جاتی ہے اور وہ نام ہے "ہمارے کنور صاحب"۔

دینا ناتھ مستؔ

مجھے دینا ناتھ مستؔ کی شخصیت بھی پسند ہے اور شاعری بھی۔ اُن کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتے رہنے کے باوجود طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ یہی بات اُن کے کلام کے متعلق کہہ سکتا ہوں۔ یہ کتنا ہی اپنا کلام مجھے کیوں نہ سُنائیں اور زیادہ سُننے کو جی چاہتا ہے۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۸ء تک میں اُن کی شخصیت اور شاعری دونوں سے فیض یاب ہوتا رہا۔ ۱۹۶۸ء میں مَیں دہلی سے کشمیر آگیا اور یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ابھی کچھ مدّت ہوئی کشمیر میں اُن سے ملاقات ہوئی گویا گذرا زمانہ واپس آگیا۔ اُن سے باتیں بھی ہوئیں۔ اُن کا کلام بھی سُنا اور یہ دیکھ کے دلی مسرّت بھی ہوئی کہ آپ نے اپنا کلام مرتّب کر کے اسے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایسے ہی فیصلوں کو ''دیر آید درست آید'' کہا جاتا ہے۔

مستؔ صاحب نے اپنے مجموعۂ کلام کی ترتیب و اشاعت کی نوید دیتے ہوئے ایک ضخیم مسودہ میرے سُپرد کیا اور میں یہ دیکھ کے حیرت میں ڈوب گیا کہ یہ ضخیم مجموعہ چند ایک نظموں کو چھوڑ

کر سارے کا سارا کشمیر ہی کے متعلق ہے۔ یوں تو کشمیر اور شاعری کا صدیوں پُرانا تعلق رہا ہے۔ دُنیا کے کسی حصّے سے جس شاعر نے کشمیر کی جھلک دیکھ لی وہ اسی کا ہو کے رہ گیا۔ ہندوستان اور ایران کے شعراء کی تو بات ہی دُوسری ہے۔ اُن کے کلام کا تو اکثر و بیشتر حصّہ فضائے کشمیر کی خوشبو سے مہک رہا ہے لیکن دینا ناتھ مستؔ نے تو کمال ہی کر دیا۔ کشمیر کے موضوع پر نظموں کا مینہ برسا دیا۔ کشمیر کا حُسن ہو یا کشمیر کی تہذیب، کشمیر کا ماضی ہو یا کشمیر کا حال، اس کی تاریخ ہو یا دیومالا، ان سب کو مستؔ صاحب کی فکرِ رسا نے اپنے گھیرے میں لے لیا ہے اور اسے شعر کا دِلکش لباس پہنا کر اُردو شاعری کا ایک مستقل باب بنا دیا ہے۔

موضوعِ کشمیر کے علاوہ بھی جس قدر نظمیں اِس مجموعے میں ہیں وہ مقصدی اَدب کی نہایت عمدہ مثال ہیں۔ مستؔ صاحب اُس شاعری کے قائل نہیں جس پر ''کوہ کندن وکاہ برآوردن'' کا اِطلاق ہوتا ہے بلکہ اس کے علی الرغم آپ کی شاعری اقبالؔ کے اس نظریئے کی تفسیر ہے ۔

جس سے دِل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

مجھے یقین ہے کہ مستؔ صاحب کا یہ مجموعۂ کلام شہرتِ عام اور بقائے دوام کا منصب حاصل کرے گا اور ان کے متعدد مجموعوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

ع - ایں دُعا از من واز جملہ جہاں آمین باد!

(۱۰ر نومبر ۱۹۷۴ء)

نارنگ ساقی

دیدمت مردے دریں قحط الرجال

مجھے اس وقت ٹھیک سے یاد نہیں آرہا ہے کہ نارنگ ساقی کے ساتھ میری پہلی ملاقات کب ہوئی۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ لاہور کے ایک سفر میں قتیل شفائی نے اور دہلی کے ایک سفر میں کنور مہندر سنگھ بیدی نے ان کا ذکر کیا۔ بیدی صاحب نے تو ملاقات میں کہا تھا کہ آج آپ رات کو کھانا ہم لوگوں کے ساتھ کھائیں۔ انھوں نے دو ایک مہمانوں کا ذکر بھی کیا۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی کہ بیدی صاحب نے گزشتہ بیس پچیس برس میں تو کبھی اپنے گھر میں کھانے کی دعوت دی نہیں آج یہ کیا معاملہ ہے لیکن جب انھوں نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ کھانا کے - ایل - نارنگ ساقی کے گھر رہے تو ایک حیرت کے ساتھ ہی دوسری حیرت شروع ہوگئی کہ یہ عجیب دعوت ہے جن سے میری ملاقات ہی آج تک نہیں ہوئی ہے ان کے یہاں میں کیسے پہنچ جاؤں۔

اب کنور صاحب کے لیے ہم تمام شعراء کے دل میں جو احترام تھا اور ہے اُس کے پیشِ نظر میں انکار تو نہ کر سکا لیکن دروغِ مصلحت آمیز سے کام لیتے ہوئے میں نے کہا کہ قبلہ میں ضرور حاضر ہوتا لیکن میں آج رات کی ریل سے جموں واپس جا رہا ہوں اس لیے معذرت خواہ ہوں۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ اس کے بعد مجھے جشنِ جمہوریت کا ایک مشاعرہ یاد آرہا ہے جو لال قلعے میں نہیں بلکہ راج گھاٹ کے قریب کسی اسٹیڈیم میں یا کسی ایسے ہی طویل و عریض لان میں منعقد ہوا تھا۔ یہ مشاعرہ بس ایک ہی بار اس اسٹیڈیم (؟) میں منعقد ہوا۔ اگلے برس یہ پھر اپنے

پرانے مقام یعنی لال قلعے میں واپس چلا گیا۔ مشاعرہ ختم ہوا تو کنور صاحب نے پوچھا کہ آپ کہاں ٹھہرے ہیں اور کیسے واپس جائیں گے؟ میں نے بتایا کہ میں اپنے بیٹے آدرش کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں آر۔ کے۔ پورم میں اور یہی سوچ رہا ہوں کہ اس وقت رات کے دو بجے کس طرح واپس جاؤں گا۔ انھوں نے کہا آپ نارنگ صاحب کے ساتھ جائیے وہ آپ کو گھر تک پہنچا دیں گے۔ میں ان سے کہہ دیتا ہوں۔ میں نے پوچھا گوپی چند نارنگ؟ کنور صاحب مسکرا دیے اور بولے نہیں نارنگ ساقی۔ مجھے کچھ مدت پہلے کی دعوت یاد آ گئی۔ غالباً صحیح معنی میں نارنگ صاحب کے ساتھ میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ نارنگ صاحب نے اس دعوت کا ذکر کیا جس میں محترم کنور صاحب نے مجھے مدعو کیا تھا۔ میں نے عدم شرکت کے لیے معذرت کی اور پھر اسی دروغِ مصلحت آمیز سے کام لے کر بتایا کہ مجھے اسی رات جموں واپس روانہ ہونا تھا اس لیے حاضر نہ ہو سکا۔

نارنگ صاحب مجھے بہت متواضع شخصیت نظر آئے۔ انھوں نے پوچھا کل رات کا آپ کا کیا پروگرام ہے۔ میرا جواب پھر وہی تھا کہ کل رات میں واپس جموں جا رہا ہوں لیکن یہ دروغِ مصلحت آمیز نہیں تھا بلکہ حقیقت تھی کیونکہ میری عادت اور مزاج ایسا ہے کہ مشاعرہ ہو یا سیمینار میں شرکت یا کہیں توسیعی لیکچر، پی۔ ایچ۔ ڈی یا ڈی لٹ وغیرہ کے Viva Voce، میں کام سے فارغ ہو کر پہلی ٹرین یا پہلی فلائٹ سے واپس گھر روانہ ہو جاتا ہوں اور اس لیے اُس شہر سے مستفید ہونے کا موقع ہاتھ سے گنوا دیتا ہوں جس سے ایسے مواقع پر چند روز اور اُسی شہر میں قیام کر کے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

نارنگ صاحب کی بات چیت میں مجھے ایک اپنے پن کا جذبہ نظر آیا۔ انھوں نے اس وقت ذکر کیا کہ وہ ادیبوں کے لطیفوں سے متعلق ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں اس سلسلے میں اگر مجھے کچھ لطائف یاد ہوں تو اُن تک پہنچا دوں۔ یہاں لطائف کے سوا اُدھر کھاہی کیا تھا۔ پطرس بخاری، محمد دین تاثیر، حفیظ جالندھری، عبدالمجید سالک، تاجور نجیب آبادی، ہری چند اختر، عرش ملسیانی، بسمل سعیدی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور احمد ندیم قاسمی سے لطیفوں کا خزانہ ہی تو حاصل کیا تھا۔ میں نے فوراً ہامی بھر لی اور کہا کہ جموں جا کر مختلف اقساط میں جیسے جیسے لطیفے یاد آتے جائیں گے

میں آپ کو بھیجتا جاؤں گا۔

اتنے میں کار نارنگ صاحب کے گھر تک پہنچ گئی۔ اُترتے ہی انھوں نے ڈرائیور کو ہدایت دی کہ وہ مجھے گاڑی میں آرکے۔ پوم تک پہنچا آئے۔ ڈرائیور جب مجھے گھر پہنچا کے واپس ہوا تو رات کے یا صبح کے ڈھائی پونے تین بج چکے تھے۔

اُسی شام کو میں جموں واپس روانہ ہو گیا اور وہاں پہنچنے کے بعد جو لطائف فوری طور پر ذہن میں آئے وہ میں نے دو کر یا تیسرے دن نارنگ صاحب کو بھیج دیے۔ ان لطائف کی رسید آگئی اور نارنگ صاحب کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

خط و کتابت میں نارنگ صاحب کا وہی اپناپن موجود تھا جو پہلی ملاقات میں نظر آیا تھا۔

اب ایسا تھا کہ ہر روز کوئی نہ کوئی لطیفہ یاد آجاتا تھا وہ میں نوٹ کر لیتا تھا اس طرح سے چند لطائف جمع ہو گئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ چند روز بعد میرے سامنے دہلی کا سفر تھا۔ میں نے سوچا یہ لطائف ڈاک سے کیا بھیجوں میں دہلی جا رہا ہوں خود ہی نارنگ صاحب کو دے دوں گا۔ میں نے ٹیلی فون کیا وہ دفتر میں موجود تھے۔ بجائے اس کے کہ وہ یا میں لطیفوں کا ذکر کرتے کہنے لگے کہ بڑی عمدہ بات ہے آج میرے یہاں چند احباب جمع ہو رہے ہیں۔ ان میں سے بعض کے نام انھوں نے لیے۔ یہ سب شعراء اور اہلِ قلم حضرات تھے۔ ان میں میرے ایک عزیز دوست کا نام نہیں تھا۔ ممکن ہے انھوں نے نام لیا ہو اور میں نے ٹھیک سے نہ سُنا ہو چنانچہ میں نے کہا کہ نارنگ صاحب کیا مجتبیٰ حسین سے آپ کی واقفیت نہیں ہے۔ بولے بھئی میں نے سب سے پہلے مجتبیٰ ہی کا تو نام لیا ہے آپ نے شاید سُنا نہیں ہے۔ اُس کے بغیر تو میرے یہاں کوئی محفل منعقد ہو ہی نہیں سکتی۔ مجھے دلی خوشی ہوئی۔ تمام مذکورہ دوستوں سے ملنے کا یہ ایک اچھا موقع تھا اور بالخصوص مجتبیٰ حسین سے۔ پاکستان ہائی کمیشن کے بھی بعض احباب ایسے تھے جن سے کبھی کبھار اتفاقیہ یا پاکستان کا ویزا بنوانے کے وقت ملاقات ہو جاتی تھی، ان سے ملاقات کا بھی یہ ایک عمدہ موقع تھا۔ مجتبیٰ کی بات یہ تھی کہ مجتبیٰ سے پہلے تو ان کے بھائی ابراہیم جلیس سے میری ملاقات ہوئی۔ کراچی میں جب کہ وہ حیدرآباد چھوڑ کر کراچی جا بسے تھے۔ ابراہیم جلیس کی شخصیت میں جو دلکشی اور دلآویزی تھی وہ لفظوں

میں نہیں آسکتی۔ اس مرحوم دوست کی یاد آتے ہی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

مجتبیٰ کے بھائی محبوب حسین جگر سے اس وقت تک حیدرآباد میں متعدد ملاقاتیں ہو چکی تھیں لیکن میں اس وقت تک اس بات سے بے خبر تھا کہ مجتبیٰ جگر کے بھائی ہیں۔ یہ "راز" حیدرآباد کے ایک سفر میں میر عابد علی خاں مالک و مدیر "سیاست" نے کھولا کہ مجتبیٰ جگر کے چھوٹے بھائی ہیں۔ دراصل بات مجتبیٰ کے مزاحیہ کالم سے شروع ہوئی تھی، عابد علی خاں نے بتایا کہ زمانہ ہوا مجتبیٰ کے Talent کو میں نے دریافت کر لیا تھا چنانچہ میں نے مجتبیٰ سے 'سیاست' کا مزاحیہ کالم لکھنے کو کہا۔ مجتبیٰ کچھ تذبذب میں تھے۔ لیکن میرے زور دینے پر وہ کالم لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے کالم لکھا اور اس پہلے کالم ہی نے قارئین "سیاست" کو ان کا فین بنا دیا اور یہ سلسلہ جاری ہو گیا۔

خیر، بات دراصل نارنگ صاحب کی ہو رہی تھی درمیان میں ایک محبوب دوست کا ذکر آگیا۔ میں بہر طور رات کو دعوت میں پہنچا۔ نارنگ صاحب کا ڈرائنگ روم احباب سے لبریز تھا بلکہ چھلک رہا تھا۔ کلام و جام کا سلسلہ جاری تھا۔ اس کے بعد طعام کی باری آئی گپ شپ اور بات چیت چل رہی تھی۔ اسی بات چیت اور گپ شپ کے درمیان نارنگ صاحب نے میرا تعارف اہلِ شعرا سے کرایا اور بتایا کہ آپ دہلی کلاتھ ملز کے سالانہ مشاعرے کے منتظم ہیں۔ یہ سُنتے ہی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰-۷۱ء تک اور شاید اس سے بہت بعد تک کے مشاعرے نظر میں پھر گئے ـــــ یا اگر میں یہ کہوں کہ لائل پور کاٹن ملز کے مشاعرے بھی پہلے مشاعرے سمیت جو غالباً فروری ۱۹۴۲ء میں منعقد ہوا تھا ایک فلم کی طرح یکے بعد دیگرے نظر کے سامنے آنے لگے۔ بی بی ساہنی اور روی چوپڑہ یاد آئے جو دہلی کلاتھ ملز مشاعرے (یعنی شنکر شاد مشاعرے) کے منتظم تھے۔ غلام ربانی تاباں یاد آئے۔ خدا ممتاز مرزا کو سلامت رکھے۔ ساہنی اور روی کے ساتھ تاباں، ممتاز اور راقم التحریر بھی انتظام میں پوری طرح شریک ہوتے تھے۔ سر سری رام، سر شنکر لال شنکر، لالہ مُرلی دھر شاد اور مشاعروں میں شریک ہونے والے شعراء تمام یاد آگئے۔ اگرچہ یہ داستان نصف صدی سے زیادہ مدت پر پھیلی ہوئی ہے لیکن اُس وقت ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ؏

جھونکا نسیم کا اِدھر آیا اُدھر گیا

اس محفل میں نارنگ کی شخصیت کے کئی پہلو، کئی تصویریں سامنے آئیں اس کا ذوقِ ادب، شعراء کی مہمان نوازی، شعر و ادب سے دلچسپی، ظریفانہ طبیعت ــــ گو یا نارنگ سے ملاقات صرف ایک شخص سے ملاقات نہ تھی بلکہ پوری ایک نسل سے یا یوں کہوں کہ گزرے ہوئے ایک دور سے ملاقات تھی۔

(۲)

لیجیے میں خیالات کی رو میں بہت آگے نکل گیا اور کئی باتیں بھول گیا۔ پہلے مجھے یہ بتانا چاہیے تھا کہ ساقی نارنگ کے ساتھ ملاقات سے بہت پہلے "شانِ ہند" کے ایڈیٹر سرور تونسوی نے مجھ سے "شانِ ہند" کے مجوزہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نمبر کے لیے مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ یہ فرمائش انھوں نے اور بھی بہت سے اہلِ قلم حضرات سے کی۔ میں نے بہت کم وقت میں اپنا مضمون "ہمارے کنور صاحب" لکھ کر انھیں دے دیا لیکن غالباً انھیں کسی اور نے مضمون لکھ کر نہیں دیا۔ اس کا سبب یہ تو نہیں تھا کہ لکھنے والوں کے دل میں کنور صاحب کے لیے کسی احترام کی کمی تھی۔ کوئی اور وجہ رہی ہوگی۔ اس بات کی شکایت کرتے ہوئے سرور تونسوی نے "شانِ ہند" کے ایک شمارے میں لکھا کہ میں نے خاصی تعداد میں اہل قلم حضرات کو کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے بارے میں مضمون لکھنے کو کہا لیکن دو ایک کے علاوہ کسی نے توجہ نہیں کی۔ یہ ادیب اور شعراء احسان فراموش لوگ ہیں۔ کنور صاحب کی ذات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کے لیے مضمون لکھنے سے گریز کرتے ہیں۔

اب بات یہ ہے کہ متعدد اہلِ قلم حضرات نے کنور صاحب کے لیے مضامین نظم و نثر لکھے اور براہِ راست کنور صاحب کو بھیج دیے۔ میں سری نگر کی ملازمت کے دوران میں ایک روز دہلی پہنچا، کنور صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے اُن مضامین کا ذکر کیا جو مختلف مضمون نگار حضرات نے ہندوستان کے گوشے گوشے سے بھی اور پاکستان سے بھی انھیں بھیجے تھے اور مجھ سے فرمائش کی میں ان مضامین کو مرتب کر دوں تاکہ انھیں کتابی صورت میں شائع کرایا جاسکے۔

میں بخوشی اس کام کے لیے آمادہ ہو گیا اور وہ تمام مضامین لے کر سری نگر آ گیا۔

لیکن سری نگر کے دفتر میں کام کی وہ بھرمار تھی کہ الہیٰ توبہ۔ نتیجۃً میں ایک مدت تک اس کام کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکا۔ کنور صاحب کی طرف سے دو تین بار ٹیلی فون آیا، میں نے ہر بار معذرت کے ساتھ جلد کام ختم کرنے کا وعدہ کیا لیکن اس کام کو ہاتھ نہ لگا سکا۔ جب اس طرح چھے ماہ کے قریب مدت گزر گئی تو مالک رام صاحب کا ٹیلی فون آیا انھوں نے میری کاہلی پر قدرے غصّہ کا اظہار کیا اور کہا کہ تمام مضامین کا پارسل بنا کر رجسٹری سے مجھے بھیج دو یا اگر عنقریب آ رہے ہو تو اپنے ساتھ لیتے آؤ۔ چنانچہ چند دنوں بعد جب میں دہلی گیا تو مضامین اپنے ساتھ لیتا گیا اور جا کر غیر مرتب مسودہ مالک رام صاحب کے حوالے کر دیا۔

اب اس طویل تحریر کا اختصار یہ ہے کہ مالک رام صاحب سے یہ غیر مرتب شدہ مضامین کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی نے لے لیے اور انھیں مرتب کر کے "ہمارے کنور صاحب" کے نام سے ایک ایسی عمدہ کتاب شائع کی کہ اس وقت تک اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی کا ایک قابلِ تعریف کارنامہ ہے اور اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے ؎ نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن تا بماند نامِ نیکت یادگار

اس کے کچھ مدت بعد ساقی صاحب نے کنور صاحب کا مجموعۂ کلام مرتب کر کے شائع کیا اور اسی طرح کنور صاحب کی خود نوشت سوانح حیات "یادوں کا جشن" کو کتابی صورت میں منظرِ عام پر لائے۔

(۳)

"ادیبوں کے لطیفے" جس کا ذکر میں نے اس مضمون کے شروع میں کیا ہے ان کی ایک مقبول تصنیف ہے جس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اب اس کتاب کی دوسری جلد منظرِ عام پر آنے والی ہے۔

ظاہر ہے کہ متذکرہ بالا ادبی کام ہر اعتبار سے قابلِ توصیف ہے لیکن میں اس بات سے بے خبر تھا کہ نارنگ ساقی تنقیدی صلاحیت کی دولت سے بھی مالا مال ہیں۔ ابھی چند روز قبل کی بات ہے میں نے ماہنامہ "تخلیق" لاہور میں یا شاید کسی اور ادبی ماہنامے میں

کشور ناہید کی کتاب "بُری عورت کی کتھا" پر نارنگ ساقی کا تبصرہ دیکھا۔ کشور کی کتاب پر قلم اُٹھانا اور پھر اتنا عمدہ معیاری تبصرہ لکھنا جس میں کشور ناہید سے اختلاف رائے بھی موجود ہو صرف اُس اہلِ قلم کا کام ہو سکتا ہے جسے قسامِ ازل کی جانب سے سچا اور کھرا تنقیدی شعور ملا ہو اور اس عطیۂ خداوندی کے لیے نارنگ ساقی دِلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(۴)

اب آخر میں ایک ذاتی بات اور ——— چند برس کی بات ہے کہ میرے پاسپورٹ کی میعاد ختم ہو گئی۔ سری نگر میں پاسپورٹ کا دفتر نذرِ آتش ہو چکا تھا جموں میں ابھی دفتر کھُلا نہیں تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ دہلی کے ریجنل پاسپورٹ آفس میں جموں و کشمیر میں رہنے والوں کے لیے ایک Counter کھُلا ہے، وہاں درخواست دی جائے۔

میں فارم پُر کر کے بھیجنے کے بعد اس سلسلے میں دو تین بار دلی آیا۔ عمّالِ حکومت وعدہ کرتے رہے کہ کل مل جائے گا، اگلے ہفتے مل جائے گا، ابھی کاغذ کشمیر سے واپس نہیں آئے وغیرہ وغیرہ۔ میں اس اُمید پر کہ آج شام کو مل جائے گا۔ دو تین بار پاسپورٹ آفس میں گیا سامنے پاسپورٹوں کا انبار لگا دیکھ کر ہر بار اُمید بندھتی تھی کہ اس انبار میں شاید میرا پاسپورٹ بھی ہو۔ ایک ایک کا نام پکارا جاتا تھا، ہر بار پاسپورٹوں کا انبار ختم ہو جاتا تھا لیکن پکارنے والے کی زبان پر میرا نام نہیں آتا تھا۔ اسی عالمِ انتظار میں باہر کے ملکوں سے مشاعروں، سیمیناروں اور دو ایک یونی ورسٹیوں میں توسیعی لیکچروں کے دعوت نامے آئے اور میں نہ جا سکا۔ ایک دن میں نے بر سبیلِ تذکرہ ساقی صاحب سے اس بات کا ذکر کیا۔ انھوں نے اُسی وقت ایک دوست کو ٹیلی فون کیا معلوم نہیں اس دوست نے کیا کہا لیکن نارنگ صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ کل صبح دس بجے آ جائیے۔

میں دس بجے گیا۔ انھوں نے مجھے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا اور سیدھا پاسپورٹ آفس کا رُخ کیا۔ وہاں یہ اپنے ایک دوست کے کمرے میں گئے اس نے ساری بات سُن کے کہا کہ نیا فارم مکمل کر کے دیجیے۔ نارنگ صاحب مجھے اپنے ساتھ لے کر وہاں آئے

جہاں فارم وغیرہ اور دیگر تمام متعلقہ کاغذات فروخت ہوتے ہیں انھوں نے یہ سب کچھ خریدا، میں نے فارم بیچنے والے کو دام دینا چاہے تو نارنگ صاحب نے مجھے روک دیا اور مجھے فارم پُر کرنے کو کہا۔ میں نے فوراً لمبا چوڑا فارم پُر کیا اور نارنگ فوراً ہی مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر پھر اپنے اُسی دوست کے دفتر میں پہنچے۔ انھوں نے فارم اور دیگر کاغذات لے لیے اور کہا کہ اگلے ہفتے پاسپورٹ لے جائیے۔ ہم دونوں شکریہ ادا کر کے واپس آئے۔ میں تو اسی روز جموں واپس آ گیا لیکن ایک ہفتہ ختم ہونے سے پہلے ہی نارنگ صاحب کا ٹیلی فون آیا کہ پاسپورٹ آ گیا ہے، اپنے پاس رکھوں یا آپ کو بھیج دوں۔ میں نے کہا کہ پندرہ روز بعد میں قطر (دوحہ) جا رہا ہوں آپ پاسپورٹ اپنے پاس رکھیے میں دہلی آ کر لے لوں گا۔ میں نے جموں ہی سے اس دوران میں قطر آنے کی بخیتہ اطلاع وہاں کی بزم کے صدر جمشید الحسن رضوی صاحب کو دے دی جمشید صاحب نے مجھے دو ایک روز بعد جموں ہی میں ٹیلی فون پر مجھے بتایا کہ آپ کو ٹکٹ فلاں ایجنٹ سے مل جائے گا۔ میں نے کہا کہ ان سے کہیے ٹکٹ فلاں پتے پر نارنگ صاحب کو دے دیں۔ نارنگ صاحب کا پتا اور ان کے تمام ٹیلی فون نمبر میں نے انھیں دے دیے۔

اب جس روز مجھے دلی سے روانہ ہونا تھا اُس سے ایک روز پہلے میں شام کی فلائٹ سے دلی پہنچا۔ اگلے دن پہلے تو مذکورہ ایجنٹ کے دفتر میں گیا۔ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کے سامنے یہ دفتر تھا۔ وہاں پتا چلا کہ جو صاحب میرے سفر کا انتظام کر رہے ہیں اور ٹکٹ وغیرہ حاصل کرنا جن کا کام ہے وہ اس وقت دفتر میں نہیں ہیں۔ چنانچہ میں متعلقہ ایئر لائنز کے دفتر میں پہنچا، کناٹ پلیس میں۔ اب اس وقت ایئر لائنز کا نام بھی یاد نہیں۔ وہاں "لنچ آور" ہو چکا تھا۔ انھوں نے تین بجے آنے کو کہا۔ تین بجے گیا تو پتا چلا کہ ٹکٹ کی ہدایت آ چکی ہے لیکن وہ اسی ایجنٹ ہی کو ملے گا مگر یہ ضروری ہے کہ پانچ بجے تک ٹکٹ لے لیا جائے۔ اب میں ہمت ہار چکا تھا چنانچہ پھر نارنگ صاحب کے وہاں پہنچا انھوں نے اپنے آدمی کو میرے ساتھ اپنی گاڑی میں بھیجا جس نے جا کے ایجنسی کے متعلقہ کلرک نما افسر سے سخت لفظوں میں بات کی۔ متعلقہ کلرک نے صورتِ حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنا کام چھوڑا ہمیں

وہیں بٹھا کے ائیر لائنز کے دفتر میں پہنچا اور مینیجمنٹ کے اندر ٹکٹ لے کے آگیا۔ ادھر وہ ٹکٹ لے کر آیا ادھر قطر سے جمشید صاحب کا ٹیلی فون آگیا۔ فون میرے متعلق تھا اس لیے ایجنٹ نے ریسیور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے اپنی بپتا کہہ سُنائی اور بتایا کہ اگر گے۔ ایل۔ نارنگ ساقی مدد نہ کرتے تو میرے لیے ٹکٹ لینا اور نتیجتہً دوحہ پہنچنا ناممکن تھا — جمشید صاحب صدرِ بزمِ اُردو دوحہ (قطر) کو جنھوں نے مجھے اقبال پر لیکچر اور مشاعرے کے لیے دعوت تھی، جب میں اپنی رُوداد سُنا چکا تو انھوں نے ٹیلی فون بزم کے چیئرمین صاحب کے ہاتھ میں دیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ ٹیلی فون ایجنٹ کو دیجیے۔ اب معلوم نہیں چیئرمین صاحب کیا کہہ رہے تھے لیکن ایجنٹ کی زبان پر سر، سر، ساری سر، معافی کا خواستگار ہوں، غلطی ہوگئی، آئندہ ایسی بات نہیں ہوگی۔ معاف کردیجیے صاحب کے الفاظ بار بار آرہے تھے۔ دراصل چیئرمین صاحب ایک بہت بڑے بزنس مین ہیں اور انھوں نے ایجنٹ سے یہی کہا تھا کہ میں تمھیں اپنے کاروبار سے الگ کرتا ہوں۔ آج سے تم برخاست ہو۔ اور ایجنٹ اس وقت بھیگی بلّی بنا بیٹھا معافیاں مانگ رہا تھا۔

خیر، کہنے کی بات یہ ہے کہ اس وقت اس ہنگامی صورتِ حال میں میری زبان پر والدِ محترم مرحوم صاحب کا یہ شعر تھا:

ایسے انسان کہاں ملتے ہیں انسانوں میں
رُوح بن کر جو سما جاتے ہیں سب جانوں میں

اور اس شعر کا اطلاق اس وقت کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی پر ہو رہا تھا۔

اُردو گھر، نئی دہلی
۱۵ ر اگست ۱۹۹۵ء

شاہ نواز — ایک طالب علم

(مسلسل محنت کی ایک مثال)

غالباً یہ دو برس کی بات ہے۔ یونی ورسٹی میں ایم.اے کے داخلے شروع ہو چکے تھے۔ صدر شعبہء اُردو کا کمرہ اور میرا کمرہ چونکہ ملحقہ ہیں اس لئے اُن سے ملنے والوں کی اگر بھیڑ ہو تو آدھی بھیڑ میرے ہی کمرے کے سامنے ہوتی ہے۔

اسی طرح ہجوم نے صدر شعبہء اُردو اور میرے کمرے کے دروازے گھیر رکھے تھے کہ داخل ہونے والے اُمیدواروں میں سے ایک طالب علم میرے کمرے کے دروازے پر رُک کے اندر آنے کے لئے اجازت طلب ہوا کہ میں نے کہا آیئے۔ وہ آکے بیٹھے تو میں اس خیال میں تھا کہ یہ ایم.اے میں داخلے کے لئے مُجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنے کام سے توجہ ہٹا کے اُن سے کہا ''فرمایئے'' تو اُنہوں نے مجھ سے اپنی اس ملاقات کی بات اشتیاقِ ملاقات سے شروع کی۔ اپنے اسکول اور کالج کے زمانے میں وہ میری نظمیں اپنے کورسوں میں

پڑھ چکے تھے۔ انہیں میرے کچھ اشعار بھی یاد تھے۔ چنانچہ ان کی بات چیت میں میری بھی کچھ دلچسپی بڑھتی گئی۔ انہوں نے اقبال پر میرے کام کا ذکر کیا تو مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ اس طالب علم کو علم وادب سے دلچسپی ہے۔

تھوڑی دیر بات چیت کرنے کے بعد اس طالب علم نے اجازت لی لیکن ہفتے میں تین چار دن اس کا آنا بدستور جاری رہا۔ اس طالب علم نے جس نے اپنا نام شاہ نواز بتایا تھا۔ علم وادب سے ہٹ کے کوئی بات مجھ سے نہیں کی۔ ایک دن اُس نے اقبال کے نظریہء زماں ومکاں کا ذکر چھیڑا۔ میں نے کہا کہ جب میں پروفیسر اور صدر شعبہء اُردو تھا تو میں جوش اور فیض کے علاوہ اقبال بھی پڑھاتا تھا اور مجھے یاد ہے کہ اقبال کے نظریہء زماں ومکاں پر میرا لیکچر چار روز میں ختم ہوتا تھا۔ گویا ایک ایک گھنٹے کا پیریڈ میں مسلسل چار روز تک لیتا تھا۔ اب میں اتنا وقت کہاں سے لاؤں۔ میں اپنے پڑھنے اور لکھنے کے کام میں مصروف ہوں۔ کام زیادہ ہے وقت کم ہے۔ تم ایسا کرو کہ اقبال پر جو میں نے چودہ پندرہ کتابیں لکھی ہیں وہ لے جاؤ۔ ''اقبال اور مغربی مفکرین'' میں آپ کو اقبال کے نظریہء زماں کی بھی ہلکی سی جھلک مل جائے گی۔ (اس وقت تک میرے طرزِ تخاطب میں ''تم'' کے ساتھ ''آپ'' کا لفظ بھی شامل ہو چکا تھا) شاہ نواز نے ان میں سے چند کتابیں ریک میں سے نکال لیں اور پانچ روز کے بعد جب وہ آیا تو بات چیت کے دوران میں مجھے محسوس ہوا کہ اس نے کتابوں کو واقعی پڑھا ہے اور اقبال کے بارے میں کافی سوالات اس کے دل ودماغ میں جمع ہوگئے جو اس نے میرے سامنے رکھے۔

اب ان ابتدائی ملاقاتوں کو طول دینے کے عوض میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ شاہ نواز نے اس مدت میں دو مضامین لکھے۔ میں نے ایک ماہنامہ ''انشا'' کلکتہ کو بھیجا اور ایک ماہنامہ ''سب رس'' کراچی کو۔ دونوں اشاعت پذیر ہوئے تو مسرت مجھے بھی ہوئی لیکن میں نے محسوس کیا کہ اُسے بے حد مسرت ہوئی ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے اپنا چھیاسٹھ برس پہلے کا زمانہ یاد آیا جب میری غزل پہلی بار ماہنامہ ''ادبی دنیا'' لاہور میں شائع ہوئی اور میری خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی۔

اس کے بعد میں نے دیکھا کہ شاہ نواز نے علامہ اقبال سے متعلق ایک چھوٹی سی کتاب لکھ کر شائع کرالی ہے۔ اور اس کی ایک جلد مجھے دیتے ہوئے یہ فرمائش کی کہ میں اس پر کچھ لکھ دوں۔ فلاں تاریخ کو فلاں صاحب کے ہاتھوں اس کتاب کی رسم اجراء عمل میں آرہی ہے۔ مجھے انہوں نے کتاب کی رسم رونمائی میں شریک ہونے کی دعوت بھی دی۔ دعوت تو میں قبول نہ کرسکا کیوں کہ اُس تاریخ کو میں کہیں باہر جا رہا تھا۔ غالباً ہندوستان سے باہر لیکن شاہ نواز کی مطبوعہ کتاب پر میں نے کچھ نہ کچھ لکھ دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس میں بعض اسقام رہ گئے ہیں۔ اگر تم مجھے مسودہ کتاب کی طباعت سے پہلے دکھا لیتے تو میں ان اسقام کو رفع کر دیتا۔ اور تمہارے ساتھ بات چیت کے بعد اس میں کچھ اضافے بھی کر دیتا۔

میں سفر سے واپس آیا تو شاہ نواز نے مجھے تقریب رُونمائی کی رُوداد تفصیل سے سُنائی۔ اخبارات کے تراشے بھی مجھے دکھائے جنہیں دیکھ کے میں خوش ہوا اور شاہ نواز سے میں نے کہا کہ ایک بات یاد رکھو کہ کم عُمر کی شہرت بعض دفعہ اہل قلم کو بھٹکا بھی دیتی ہے۔ میرے پاس بھی اس طرح کے بعض تراشے موجود ہیں۔ میری کتابوں پر تبصروں اور مقالات کی صورت میں لیکن میں نے کسی کتاب کی رسمِ رونمائی کے جلسے کا نہ خود اہتمام کیا نہ کسی دوست کے ذمے یہ کام لگایا۔ جب کسی ادارے کے منتظمین نے اس طرح جلسے کا اہتمام کیا اور مجھے دعوت دی تو میں اس میں شریک ہوا اور میں نے منتظمین کا دِلی طور پر شکریہ ادا کیا۔ میں اَدبی جرائد کو تبصرے کے لئے کتاب بھیجتا ہوں اور اس پر لکھ دیتا ہوں ''تبصرے کے لئے''۔ تبصرہ شائع ہو جائے تو اسے بہ نظر غائر پڑھتا ہوں اور محاسن یا معائب کی نشان دہی پر غور کرتا ہوں۔ آپ بھی اپنی توجہ اپنے کام پر مبذول رکھئے۔ اچھا اور معیاری کام کسی نہ کسی صورت میں اپنے آپ کو منوا لیتا ہے۔ اس بات کو خاصی مدت گُزر گئی۔ ابھی چند روز ہوئے شاہ نواز ایک ضخیم مسودہ میرے پاس لائے اور فرمائش کی کہ اسے دیکھوں اور اس پر کچھ لکھوں۔ مسودے کا نام شاہ نواز نے رکھا ہے ''اُردو انجیکلو'' نام سے تو میں کچھ نہ سمجھا لیکن جب مسودے پر میں نے ایک نظر ڈالی تو مندرجات کی وسعت دیکھ کر

حیرت زدہ رہ گیا۔ مجھے اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ علمی اور اَدبی موضوعات پر شاہ نواز اتنی ضخیم کثیر الابعاد کتاب تیار کر سکتا ہے۔ میں نے اس انداز کی کتاب تو اب تک نہیں دیکھی تھی لیکن اس انداز کی فلم کے بعض حصے ٹیلی ویژن پر دیکھ چکا تھا اور اس کا نام ہے K.B.C یعنی کون بنے گا کروڑپتی۔ اسی ''کون بنے گا کروڑپتی'' کے پیٹرن پر شاہ نواز نے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ اس میں اُردو نظم و نثر کی تمام اصناف آگئی ہیں۔ مثلاً مثنوی، مسدس، مخمس، مثلث، قطعہ، رباعی، غزل اور اس کے ساتھ افسانے، اِنشاء پردازی وغیرہ۔

سودے پر ایک نظر ڈالنے کے لئے میں نے اس کی ورق گردانی شروع کی تو مصنف ہی کے لکھے ہوئے دیباچے کے بعد صفحہ نمبر (۱) پر پڑی۔ یہ صفحہ یوں شروع ہوا ہے:

(۱) اُردو کس زبان کا لفظ ہے؟

(الف) فارسی (ب) ہندوی

(ج) ترکی (د) پہلوی

نیچے اس کا جواب درج ہے۔

(ج) ترکی

(۲) اکبر سے پہلے کس سلطان کے عہد میں مغل بادشاہوں اور شہزادوں کے خیموں کو اُردو کہا جاتا تھا۔

(الف) ترک بادشاہ (ب) ساسانی بادشاہ

(ج) مغل بادشاہ (د) سلجوقی بادشاہ

(ج) مغل بادشاہ

اسی طرح سے یہ کتاب ۱۸×۲۲×۸ سائز کے ایک سو اکیاون صفحات پر مشتمل ہے۔

اس انداز کی کتاب میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ کتاب کیا ہے ایک چھوٹی موٹی انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں ادب کے ساتھ ساتھ ادبی تاریخ بھی محفوظ ہے۔ اس میں تنقید کے پہلو

بھی شامل ہیں اور تحقیق کے بھی مثلاً:

(۱۵) چودھویں صدی میں اُردو کون سی زبان تھی؟

(الف) بول چال کی زبان تھی (ب) تصنیف و تالیف کی زبان تھی

(ج) علاقائی زبان تھی (د) درباری زبان تھی

(الف) بول چال کی زبان تھی

(۲۰) کربل کتھا کا خالق کون ہے؟

(الف) میراں جی (ب) غواصی

(ج) فضلی (د) ابن نشاطی

(ج) فضلی

کتاب کے مرتب نے جو سوالات قائم کیے ہیں اُن کے جوابات کے لئے معلوم نہیں انھیں تنقید اور تحقیق کی کتنی کتابیں کھنگالنا پڑی ہوں گی لیکن سوالات قائم کرنے کے لئے بھی انھیں کتنا مطالعہ کرنا پڑا ہوگا اِس کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔

مثلاً چند سوالات دیکھیے:-

(۲۲) سترھویں صدی میں اُردو کی اصلاح کس نے کی؟

(۲۴) اُردو شاعری کا چرچا کب شروع ہوا؟

(۲۸) اُردو کا ادبی معیار کب متعین ہوا؟

(۳۲) علم و فنون کی کئی کتابوں کے ترجمے کب ہوئے؟

(۳۳) جدید ہندی کا آغاز کس ریاست سے ہوا؟

(۳۶) انجمن ترقیِ اُردو کا قیام کب ہوا؟

(۴۰) اُردو دستورِ ہند کے کس جدول میں شامل ہے؟

(۴۹) کس ماہر لسانیات نے دکنی کو گجری کا نام دیا؟

ایک سوال گرائمر سے متعلق دیکھیے:-

(۵۵) کس زبان میں جملوں کی ساخت میں فعل کو فاعل کے مطابق لایا جاتا ہے؟

ایک اور سوال خالص تحقیقی زاویہ نظر سے دیکھیے:-

(۵۸) ۱۹۴۷ء میں حیدر آباد کے کس مصنف نے نہال چند لاہوری کی تصنیف ''بکاولی'' کے مقابلے میں اپنی تصنیف ''تاولی'' پیش کی؟

خالص تاریخی انداز کے سوال کے دو ایک نمونے ملاحظہ ہوں:-

(۶۴) محمد بن تغلق کے خلاف کس نے علم بغاوت بلند کیا؟

(۶۵) حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو دراز کس سلطان کے عہد میں دکن شریف لائے؟

ادیبوں کی تاریخ پیدائش سے متعلق سوالات بھی اس ذخیرے میں شامل ہیں اور کتابوں کی تاریخ تصنیف کے متعلق بھی، کس ادیب کو شمس العلماء کا خطاب کب ملا اور کس کو ایل. ایل. ڈی کی اعزازی ڈگری کب عطا ہوئی۔ فلاں اہلِ قلم کس خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور فلاں اہلِ قلم کی کتاب کتنے ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ فلاں کتاب کتنی جلدوں پر مشتمل ہے اور فلاں نثر نگار کس شہر میں پیدا ہوئے، فلاں کے ناولوں کا نقطہ نظر کیا تھا، فلاں ناول کس مصنف نے لکھا، فلاں اہلِ قلم کا اصلی نام کیا تھا، فلاں اہلِ قلم کا پورا نام کیا ہے، فلاں اخبار کب جاری ہوا وغیرہ وغیرہ۔

اُردو شاعری سے متعلق سوالات پر سودا، درد، آتش، مصحفی، انشاء اللہ خاں، ظفر علی خاں، داغ، امیر مینائی، اکبر الہ آبادی، میر انیس، مرزا دبیر، مولانا حالی، شبلی، اقبال، محروم، فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، عزیز لکھنوی، جلیل مانک پوری، حفیظ جالندھری اور دوسرے معتدد شعرا کے نام گرامی سے سوالات و جوابات مزین ہیں۔

نثر نگار حضرات کی محفل میں سر سید احمد خاں، شیخ سر عبدالقادر، ابوالکلام آزاد، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، کنھیا لال کپور اور متعدد حضرات جلوہ افروز ہیں۔

علامہ اقبال پر سوالات مصنف کی اقبال کی طرف خاص رُجحانِ طبع کی غمازی کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال کے متعلق تو اس کتاب العلم میں پورا ایک باب موجود ہے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں یہ کتاب ایک چھوٹی سی انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے تحقیقی موضوعات پر مقالے لکھنے والے حضرات بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ اور اُردو شعر و شاعری، اُردو کی تاریخ، نثر نگاری اور فکشن سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بھی۔ میں تو اس کتاب کے بارے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

نسیمِ حجاز

جگن ناتھ آزاد

"جگن ناتھ آزاد نے مُسلمانوں کی شان وشوکت سے معمور تاریخ وروایت اور پُرفخر اور ناقابلِ فراموش کارناموں کو یاد دِلا کر ان سے سوال کیا کہ آخر وہ اپنی شاندار روایات وخصوصیات سے کیوں دَست بردار ہوتے جارہے ہیں۔ اُن کا جمال وجلال تو اپنی عظیم الشان روایت اور اپنے مُمتاز اوصاف سے وابستہ رہنے میں ہے، اگر اپنی تہذیب سے ان کے بے گانہ وشی کا یہی حال رہا تو اُنھیں تاریخ کا افسانہ بن جانے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ جگن ناتھ آزاد کی تلقین یہ ہے کہ مُسلمان اِس مُلک میں اپنے اِمتیازات وتشخصات کے ساتھ رہیں اور اپنی عظمتوں کے آثار اور گنجیوں کے محافظ ہیں۔"

ضیاء الدّین اصلاحی

مدیر ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ (یوپی)

☆پہلا اڈیشن ☆ہدیہ: ۱۰۰ روپے

ملنے کا پتا

انجمن ترقی اُردو (ہند) اُردو گھر، ۲۱۲ راؤز ایونیو، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

کمپوزنگ: کریسنٹ ہاؤس آف انفارمیشن ٹکنالوجی، 267- جوگی گیٹ، جموں- 180001 (جے اینڈ کے) انڈیا

فون برائے رابطہ: 0191-2543645

☆پروپرائٹر: نسرین اختر قریشی ☆ڈی ٹی پی آپریٹر: جگجیون رام بھارتی

انتخابِ کلام

انتخابِ کلام ہے جگن ناتھ آزاد کی غزلوں، نظموں اور رباعیوں کا، جسے انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے شائع کیا ہے۔ اس سے قبل انجمن اسی قسم کا مختصر سا انتخاب بارہ دیگر مشہور شعرا کا شائع کر چکی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس نوع کے انتخاب گو مختصر ہوتے ہیں، لیکن وہ شاعر کا تعارف ضرور ہیں۔ اور اُن لوگوں کے لیے جو شعرا کے پورے مجموعۂ کلام کی اشاعت کا انتظار نہیں کر سکتے یا ان کے مطالعے کے لیے کافی وقت نہیں دے سکتے، یہ سلسلہ بہت مفید ہے۔

جگن ناتھ آزاد اِس وقت کے اُن پختہ کار، پختہ فہم اور ذی شعور شاعروں میں سے ہیں جن کا کلام بڑی معیاری حیثیت رکھتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد، نظم، غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں، اور جو کچھ کہتے ہیں بہت سنبھل کر اور بڑے "کارآگہانہ" طریقے سے کہتے ہیں، اُن کے جذبات کی صداقت، لب ولہجہ کی شگفتگی، اندازِ بیان کی دل کشی اور خیال کی بلندی بڑا رچاؤ اپنے اندر رکھتی ہے اور اس کا راز صرف یہ ہے کہ ان کا تعلیمی پس منظر کلاسیکی پختگی اپنے اندر رکھتا ہے اور فارسی زبان پر عبور رکھنے کی وجہ سے اس کی حلاوت وشیرینی بھی ان کے کلام میں منتقل ہوگئی ہے۔

ماہنامہ "نگار" لکھنؤ — نیاز فتح پوری

تیسرا اڈیشن ——— قیمت: ۵۰ روپے

ملنے کا پتا: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی -۲

تعمیرِ فکر

جگن ناتھ آزاد

"تعمیرِ فکر" کے مقالات چار حصّوں میں منقسم ہیں۔ پہلا حصّہ "اقبالیات" سے متعلق ہے اور دُوسرا "تنقید و تحقیق" سے۔ تیسرے حصّے کو انھوں نے "کچھ شاعری کچھ نثر" کا ذیلی عنوان دیا ہے جبکہ چوتھے کو "اُردو کے تعلق سے" کے تحت شاملِ کتاب کیا ہے۔ لیکن چاروں ابواب کے تحت مشمولہ مقالات میں آزاد کی بلند پائے کی تحقیق بھی موجود ہے اور اُن کی تنقیدی بصیرت و فہم بھی۔ "کچھ شاعری کچھ نثر" والے باب میں ایسے متعدد مقالات موجود ہیں جہاں آزاد نے نئی نسل سے تعلق رکھنے والے اُدبا و شعراء کے فن سے بڑی فراخدلانہ بحث کی ہے اور اُن کے لئے ایسی راہیں ہموار کرنے کی سعی کی ہے جن راہوں پر گامزن ہو کر نئے لکھنے والے ادبی دُنیا میں ایک مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ باب آزاد کو ایک رہبر و رہنما کی صورت میں پیش کرتا ہے۔"

امین بنجارا

پہلا اڈیشن

قیمت ۲۵۰/روپے

ملنے کے پتے

انجمن ترقی اُردو (ہند) اُردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی- ۱۱۰۰۰۲

کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، ۲۶۷- جوگی گیٹ، جموں- ۱۸۰۰۰۱